الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

منزل پر پہنچنا صرف ان لوگوں کے لئے مقدر ہے
جو راستہ کے کانٹوں سے بچ کر آگے بڑھ جائیں

فروری ۱۹۸۶
شمارہ ۱۱۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۱ فروری ۱۹۸۶

فہرست

قدرت کا سبق	صفحہ ۲	موت	صفحہ ۱۳
ایک عام برائی	۳	قدر دانی	۱۴
کامیابی کی قیمت	۴	اعتراف نہیں	۱۶
مقصدیت	۵	انسان کی شخصیت	۱۷
بنیاد	۷	جانے بغیر بولنا	۱۸
قربانی	۸	مفاد پرستی	۱۹
مایوسی نہیں	۹	مغالطہ	۲۰
صحیح سبق	۱۰	قرآنی طریقہ	۲۱
مسائل اور مواقع	۱۱	ایک سفر	۲۴
خدا کا ذکر	۱۲	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۴

قدرت کا سبق

ایک شخص نے اپنا ایک تجربہ لکھا ہے کہ ایک ماہی گیر نے ایک بار مجھے بتایا کہ کیکڑے کی ٹوکری پر کسی کو ڈھکن لگانے کی ضرورت نہیں۔ اگر ان میں سے کوئی کیکڑا ٹوکری کے کنارے سے نکلنا چاہتا ہے تو دوسرے وہاں پہونچتے ہیں اور اس کو پیچھے کی طرف کھینچ لیتے ہیں :

A fisherman once told me that one doesn't need a cover for a crab basket. If one of the crabs starts climbing up the side of the basket, the others will reach up and pull it back down.

Charles Allen, in *The Miracle of Love.*

کیکڑے کی یہ فطرت یقیناً خدا نے بنائی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کیکڑے کا یہ طریقہ ایک خدائی طریقہ ہے۔ کیکڑے کی مثال سے خدا انسانوں کو بتا رہا ہے کہ انھیں اپنی اجتماعی زندگی کو کس طرح چلانا چاہیے۔

اجتماعی زندگی میں اتحاد کی بے حد اہمیت ہے۔ اور اتحاد قائم کرنے کی بہترین تدبیر وہی ہے جو کیکڑے کی دنیا میں خدا نے قائم کر رکھی ہے۔ کسی انسانی مجموعے کے افراد کو اتنا باشعور ہونا چاہیے کہ اگر ان میں سے کوئی شخص ذہنی انحراف کا شکار ہو اور اپنے مجموعے سے جدا ہونا چاہے تو دوسرے لوگ اس کو پکڑ کر دوبارہ اندر کی طرف کھینچ لیں۔ "ٹوکری" کے افراد اپنے کسی شخص کو ٹوکری کے باہر نہ جانے دیں۔

اسلامی تاریخ میں اس کی ایک شاندار مثال حضرت سعد بن عبادہ انصاری کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کے مسئلہ پر ان کے اندر انحراف پیدا ہوا۔ بیشتر صحابہ اس پر متفق تھے کہ قبیلۂ قریش کے کسی شخص کو خلیفہ بنایا جائے۔ مگر سعد بن عبادہ کے ذہن میں یہ آیا کہ خلیفہ انصار کا کوئی شخص ہو یا پھر دو خلیفہ بنائے جائیں، ایک مہاجرین میں سے اور دوسرا انصار میں سے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ سعد بن عبادہ کے قبیلہ کے تمام لوگ اپنے سردار کی راہ میں رکاوٹ بن گیے۔ انھوں نے سعد بن عبادہ کو کھینچ کر دوبارہ "ٹوکری" میں ڈال لیا۔ اور ان کو اس سے باہر جانے نہیں دیا۔

ایک عام برائی

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو نسل چلی، بعد کو اس کی دو شاخیں ہو گئیں۔ ایک بنی اسرائیل، دوسرے بنی اسماعیل۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جو پیغمبر آئے وہ سب بنی اسرائیل میں آئے۔ اس کے بعد آخری پیغمبر محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت بنی اسماعیل میں ہوئی۔ بنی اسرائیل (یہود) نے آخری پیغمبر کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ فعل حسد کی وجہ سے ہے۔ ان کو اس بات کی جلن ہے کہ اللہ نے بنی اسماعیل کو کیوں اپنے فضل سے نوازا (ام یحسدون الناس علیٰ ما آتاھم اللہ من فضلہ، النساء ۵۴) اس سے معلوم ہوا کہ وہ اخلاقی برائی جس کو حسد کہا جاتا ہے وہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ آدمی اپنے سوا دوسرے کی بڑائی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔

یہ ایک عام بات ہے کہ کسی چھوٹے آدمی کی برائی کی جائے تو سننے والوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس کسی بڑے آدمی کی برائی کی جائے تو ہر آدمی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کو ماحول میں کوئی بڑائی حاصل ہو جائے تو اس کے خلاف ہر الٹی بات کو لوگ بلا تحقیق مان لیتے ہیں اور فوراً اس کا چرچا کرنے لگتے ہیں۔ آپ ایک دولت مند کی برائی بیان کریں۔ ایک عزت یافتہ شخص کو بے عزت کرنے والی باتیں کریں۔ ایک صاحب اقتدار کے ظلم کی داستانیں لوگوں کو سنائیں۔ آپ دیکھیں گے کہ لوگ فوراً آپ کی بات مان رہے ہیں۔ بہت جلد آپ کے گرد لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ کسی کی بڑائی کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اپنے سوا کسی اور کو بلند مقام پر دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس نفسیات کا نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی ماحول میں کسی شخص کو کسی اعتبار سے بڑائی کا مقام حاصل ہوتا ہے تو تمام لوگوں کے دل میں اس کے خلاف کھلا یا چھپا حسد پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر ایک اندر سے یہ چاہنے لگتا ہے کہ اس کو اس کی بڑائی کے مقام سے گرائے۔ چنانچہ جب کوئی شخص ایسی بات کہتا ہے جس سے بڑے کی بڑائی مجروح ہوتی ہو تو فوراً لوگ اس کو اپنے دل کی بات سمجھ کر مان لیتے ہیں، وہ فوراً ایسے آدمی کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔

یہ مشغلہ آج لوگوں کو بڑا لذیذ مشغلہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ یقینی طور پر ابلیس لعین کی سنت ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں انھیں ڈرنا چاہیے کہ ان کا وہی انجام ہو جو آدم کی بڑائی کو نہ ماننے کے نتیجہ میں ابلیس کا ہوا۔

کامیابی کی قیمت

ایک طالب علم کے سرپرست کالج کے پرنسپل سے ملے۔

"آپ لوگوں نے جو تعلیمی نصاب بنایا ہے وہ بہت لمبا ہے۔ طالب علم کی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف پڑھنے میں گزر جاتا ہے" انھوں نے کہا

"اس کا حل تو بہت آسان ہے" پرنسپل نے جواب دیا

"وہ کیسے"

"آپ مختصر نصاب بھی بنا سکتے ہیں۔ اصل میں مدت کا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ طالب علم کے اندر کیسا علمی معیار چاہتے ہیں۔ قدرت کو شاہ بلوط (Oak) کا درخت اگانے میں سو برس لگ جاتے ہیں۔ مگر جب وہ ککڑی کا درخت اگانا چاہتی ہے تو اس کے لیے صرف چھ مہینے درکار ہوتے ہیں۔ اگر آپ معمولی معیار چاہتے ہوں تو چند سال کی تعلیم بھی کافی ہو سکتی ہے مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانے کے لیے تو بہر حال زیادہ وقت دینا پڑے گا"

یہی اصول زندگی کے تمام معاملات کے لیے ہے۔ چھوٹی ترقی چھوٹی کوشش سے مل سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ بڑی ترقی چاہتے ہوں تو لازماً آپ کو بڑی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ چھوٹی کوشش سے کبھی بڑی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

ہرولڈ شرمن (Harold Sherman) نے اسی بات کو ان الفاظ میں کہا ہے:

> Every worthwhile accomplishment has a price tag on it: how much are you willing to pay in hard work and sacrifice, in patience, faith, and endurance to obtain it.

ہر کامیابی کے ساتھ قیمت کا ایک پرچہ لگا ہوا ہے۔ اب یہ آپ پر موقوف ہے کہ آپ اس کو حاصل کرنے کے لیے محنت اور قربانی، صبر، یقین اور برداشت کی شکل میں کتنی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بازار میں آدمی کو وہی چیز ملتی ہے جس کی اس نے قیمت ادا کی ہو۔ اسی طرح ہر ترقی اور ہر کامیابی کی بھی ایک قیمت ہے اور آدمی کو وہی ترقی اور وہی کامیابی ملے گی جس کی اس نے قیمت ادا کی ہو۔ نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔

مقصدیت

جاپان نے ۱۹۳۱ میں چین کے شمال مشرقی حصہ (منچوریا) پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں اپنی پسند کی حکومت قائم کر دی۔ اس کے بعد چین اور جاپان کے تعلقات خراب ہو گیے۔ ۷ جولائی ۱۹۳۷ کو بیجنگ (پیکنگ) کے پاس مارکو پولو برج کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ نے دبے ہوئے جذبات کو بھڑکا دیا۔ اور دونوں ملکوں کے درمیان فوجی ٹکراؤ شروع ہو گیا جو بالآخر دوسری جنگِ عظیم تک جا پہونچا۔

اس وقت سے چین اور جاپان کے درمیان نفرت اور کشیدگی پائی جاتی تھی۔ چند سال پہلے جاپان اور چین کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس کے مطابق جاپان کو چین میں ایک اسٹیل مل قائم کرنا تھا مگر معاہدہ کی تکمیل کے بعد چینی حکومت نے اچانک اس کو منسوخ کر دیا۔

چین کے نئے وزیر اعظم ڈینگ زاپنگ (Deng Xiaoping) نے حال میں اشتراکی انتہا پسندی کو ختم کیا اور کھلے دروازہ (Open Door) کی پالیسی اختیار کی تو جاپان کے لیے دوبارہ موقع مل گیا۔ چنانچہ آج کل جاپان نے چین میں زبردست یورش کر رکھی ہے۔ آپ اگر جاپان سے چین جانا چاہیں تو آپ کو ہوائی جہاز میں اپنی سیٹ تین ماہ پیشگی بک کرانی ہو گی۔ جاپان سے چین جانے والے ہر جہاز کی ایک ایک سیٹ بھری ہوئی ہوتی ہے۔

چین میں تجارت کے زبردست امکانات ہیں۔ جاپان چاہتا ہے کہ ان تجارتی امکانات کو بھرپور استعمال کرے۔ اس مقصد کے لیے جاپان نے یک لخت طور پر ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا دیا۔ ایک سیاح کے الفاظ میں جاپان نے طے کر لیا کہ وہ چین کی طرف سے پیش آنے والی ہر ایذا رسانی (Pinpricks) کو یک طرفہ طور پر برداشت کرے گا۔

مذکورہ سیاح نے لکھا ہے کہ میرے قیام ٹوکیو (جون ۱۹۸۵) کے زمانہ میں ریڈیو بیجنگ نے اعلان کیا کہ چین ایک میوزیم بنائے گا جس میں تصویروں کے ذریعہ یہ دکھایا جائے گا کہ جاپانیوں نے چینیوں کے اوپر ماضی میں کیا کیا مظالم کیے ہیں۔ اس میوزیم کا افتتاح ۱۹۸۷ میں ہوگا جب کہ مارکو پولو کے حادثہ کو ۵۰ سال پورے ہو جائیں گے۔ جاپانیوں سے اس خبر پر تبصرہ کرنے کے لیے

کہا گیا تو انھوں نے خاموشی اختیار کی۔ جب زیادہ زور دیا گیا تو انھوں نے جواب دیا :

You know, our Chinese friends have a way of twisting our tails, and appealing to our conscience.

آپ جانتے ہیں کہ یہ ہمارے چینی دوستوں کا مہمیز لگانے کا طریقہ ہے۔ وہ ہمارے ضمیر کو متوجہ کر رہے ہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۳ جون ۱۹۸۵)

جاپان کے سامنے ایک مقصد تھا۔ یعنی اپنی تجارت کو فروغ دینا۔ اس مقصد نے جاپان کے اندر کردار پیدا کیا۔ اس کے مقصد نے اس کو حکمت، برداشت، اعراض کرنا اور صرف بقدر ضرورت بولنا سکھایا۔ اس کے مقصد نے اس کو بتایا کہ کس طرح وہ ماضی کو بھلا دے اور تمام جھگڑوں اور شکایتوں کو یک طرفہ طور پر دفن کر دے تاکہ اس کے لیے مقصد تک پہونچنے کی راہ ہموار ہو سکے۔

بامقصد گروہ کی نفسیات ہمیشہ یہی ہوتی ہے۔ خواہ اس کے سامنے تجارتی مقصد ہو یا کوئی دوسرا مقصد۔ اور جب کوئی گروہ یہ صفات کھو دے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس گروہ نے مقصدیت کھو دی ہے۔ اس کے سامنے چوں کہ کوئی مقصد نہیں اس لیے اس کے افراد کا کوئی کردار بھی نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ان کی بے کرداری ہے۔ جس میدان میں بھی تجربہ کیجیے، آپ فوراً دیکھیں گے کہ مسلمانوں نے اپنا کردار کھو دیا ہے۔ ان کے اوپر کسی ٹھوس منصوبہ کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ جہاں بھی انھیں استعمال کیا جائے وہ دیوار کی کچی اینٹ ثابت ہوتے ہیں۔ وہ دیوار کی پختہ اینٹ ہونے کا ثبوت نہیں دیتے۔

اس کمزوری کی اصل وجہ یہی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے مقصد کا شعور کھو دیا ہے۔ وہ ایک بے مقصد گروہ ہو کر رہ گیے ہیں۔ ان کے سامنے نہ دنیا کی تعمیر کا نشانہ ہے اور نہ آخرت کی تعمیر کا نشانہ۔ یہی ان کی اصل کمزوری ہے۔ اگر مسلمانوں میں دوبارہ مقصد کا شعور زندہ کر دیا جائے تو دوبارہ وہ ایک جاندار قوم نظر آئیں گے۔ وہ دوبارہ ایک باکردار گروہ بن جائیں گے جس طرح وہ اس سے پہلے ایک باکردار گروہ بنے ہوئے تھے۔

بنیاد

مکان کی تعمیر کا آغاز بنیاد سے ہوتا ہے۔ ایک انجینیر کو "اسکائی اسکریپر" بنانا ہو تب بھی وہ بنیاد ہی سے اس کا آغاز کرے گا۔ بنیاد سے آغاز کرنا دوسرے لفظوں میں اس حقیقت واقعہ کا اعتراف کرنا ہے کہ آدمی کہاں کھڑا ہوا ہے اور وہ کون سا نقطہ ہے جہاں سے وہ اپنے سفر کا آغاز کر سکتا ہے۔

اس دنیا میں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ یہاں ایک طرف قدرت (نیچر) ہے جو ہم سے الگ خود اپنے قوانین پر قائم ہے۔ اسی کے ساتھ یہاں دوسرے انسان ہیں۔ ان میں سے ہر انسان کے سامنے اپنا مقصد ہے اور ہر شخص اپنے مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ ہم ان حقیقتوں کو جانیں اور ان کی رعایت کرتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

زندگی کا سب سے بڑا راز حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ اعتراف کرنے والا آدمی اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ جس طرح اپنے "ہے" کو جانتا ہے اسی طرح وہ اپنے "نہیں" سے بھی واقف ہے۔ وہ ایک طرف اگر یہ جانتا ہے کہ کیا چیز اس کے لیے قابل حصول ہے تو اسی کے ساتھ وہ اس سے بھی باخبر ہے کہ کیا چیز اس کے لیے قابل حصول نہیں۔ وہ آغاز اور انجام کے فرق کو جانتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ اپنا پہلا قدم اسے کہاں سے اٹھانا ہے اور وہ کون سا مقام ہے جہاں وہ آخر کار اپنے آپ کو پہونچانا چاہتا ہے۔

اعتراف بزدلی نہیں، اعتراف سب سے بڑی بہادری ہے۔ اعتراف کر کے آدمی بے عزت نہیں ہوتا، وہ عزت کے سب سے بڑے مقام کو پا لیتا ہے۔ جو شخص اعتراف نہ کرے وہ گویا فرضی خیالات میں جی رہا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اعتراف کرے وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس نے فرضی تخیلات کے طلسم کو توڑ دیا ہے۔ وہ حقائق کی دنیا میں سانس لے رہا ہے۔ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھ رہا ہے جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔

چیزوں کو ان کی اصل صورت میں دیکھنا دانش مندی کا آغاز ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہو وہی کامیابی کے آخری زینہ پر پہونچتا ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو وہ یا تو اپنا سفر شروع نہ کر سکے گا اور اگر سفر شروع ہو گیا تب بھی وہ درمیان میں اٹک کر رہ جائے گا۔ وہ کبھی آخری منزل تک نہیں پہونچ سکتا۔

قربانی

۱۹۶۲ کا واقعہ ہے۔ مسٹر سریش ایچ کامدار کی عمر اس وقت ۲۹ سال تھی۔ وہ کلکتہ کے میڈیکل کالج اسپتال میں اپنے ایک بیمار عزیز کو دیکھنے کے لیے گیے۔ وہاں اس وقت ایک مریض لایا گیا۔ اس کا آپریشن ضروری تھا اور اس کے لیے فوری طور پر خون (Blood transfusion) کی ضرورت تھی۔ یہ اس آدمی کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ مسٹر کامدار کا بلڈ گروپ اے (A-Rh Positive) تھا۔ ان کو مریض پر ترس آیا۔ انھوں نے رضا کارانہ طور پر خون کی پیش کش کر دی۔ ایک زندگی بچالی گئی۔

مسٹر کامدار کی عمر اب ۵۳ سال ہو چکی ہے۔ کلکتہ کے مذکورہ تجربہ کے بعد انھوں نے خون دینے کو اپنا مستقل مسلک بنالیا۔ پچھلے ۲۴ سال کے اندر وہ ایک سو بار رضا کارانہ طور پر خون دے چکے ہیں۔ انھیں ریڈ کراس سوسائٹی نے اعلیٰ امتیاز کے تمغے عطا کیے ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۲ دسمبر ۱۹۸۵)

دنیا میں ایسے لوگ بہت ہیں جو فوری جوش سے بھڑک اٹھیں اور لڑ کر اپنا خون دے دیں۔ مگر ایسے لوگ بے حد کم یاب ہیں جو سوچے سمجھے ذہن کے تحت مستقل خون دیں اور زندگی کے آخری لمحات تک دیتے رہیں۔

یہ دوسرے لوگ بظاہر چھوٹا کام کرنے والے لوگ نظر آتے ہیں۔ مگر یہی لوگ ہیں جو دنیا میں بڑا کام کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو تاریخ بناتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی انفرادی قربانیوں کے ذریعہ پوری قوم کو آگے لے جاتے ہیں۔ پہلی قسم کی قربانی اگر لیڈر بناتی ہے تو دوسری قسم کی قربانی قوم تیار کرتی ہے۔ پہلی قربانی اگر حال کی تعمیر ہے تو دوسری قربانی مستقبل کی تعمیر۔

ایک بڑا مکان اچانک نہیں بنتا۔ سالہا سال تک ایک ایک اینٹ جوڑی جاتی ہے، اس کے بعد وہ مجموعہ تیار ہوتا ہے جس کو مکان کہتے ہیں۔ ایک تالاب اچانک نہیں بھر جاتا۔ بارش ایک عرصہ تک بوند بوند پانی اس میں پہونچاتی ہے تب ایک بھرا ہوا تالاب وجود میں آتا ہے۔ یہی معاملہ انسانی معاملات کا ہے۔ انسانی زندگی میں کوئی بڑا واقعہ اس وقت ظہور میں آتا ہے جب کہ بہت سے لوگ اس کے لیے تیار ہوں کہ وہ اپنی تھوڑی کوششوں کو لمبی مدت تک جمع کریں گے۔ انسانی کامیابی صابرانہ عمل کا نتیجہ ہے نہ کہ وقتی اقدام کا نتیجہ۔

مایوسی نہیں

ابراہام لنکن (۱۸۰۹ - ۱۸۶۵) جدید امریکہ کا معمار ہے۔ امریکہ کی سیاسی تاریخ میں اس کو بہت نمایاں مقام حاصل ہے۔ مگر لنکن کو یہ کامیابی اچانک نہیں ملی۔ اس کامیابی تک پہونچنے کے لیے اس کو ناکامی کے اَن گنت زینے طے کرنے پڑے۔ لنکن کی زندگی کو ایک شخص نے چند الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے :

> This man had failed in business in '31. He was defeated in politics in '32, he failed once again in business in '34. He had a nervous breakdown in '41. In '43 he hoped to receive his party's nomination for Congress but didn't. He ran for the Senate and lost in '55; he was defeated again in '58. A hopeless loser, some said. But Abraham Lincoln was elected President of the United States in 1860. He knew how to accept defeat—temporarily.

ایک آدمی ۱۸۳۱ میں تجارت میں ناکام ہوگیا۔ اس نے ۱۸۳۲ میں سیاست میں شکست کھائی۔ ۱۸۳۴ میں دوبارہ اس کو تجارت میں ناکامی ہوئی۔ ۱۸۴۱ میں اس پر اعصاب کا دورہ پڑا۔ ۱۸۴۳ میں وہ الکشن میں کھڑا ہوا مگر ہار گیا۔ ۱۸۵۸ کے الکشن میں اس کو دوبارہ شکست ہوئی۔ لوگ اس کے بارے میں کہنے لگے کہ یہ شخص کبھی کامیاب نہ ہوگا۔ مگر یہی وہ شخص ہے جو ۱۸۶۰ میں ابراھام لنکن کے نام سے امریکہ کا ۱۶ واں صدر منتخب ہوا۔ اس کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ جانتا تھا کہ شکست کو کیسے تسلیم کیا جائے، عارضی طور پر نہ کہ مستقل طور پر (ستمبر ۱۹۷۲)

کامیابی ہمیشہ ناکامیوں کے بعد آتی ہے۔ اس دنیا میں فتح صرف اس شخص کے لیے ہے جو شکست کو مان لینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور ناکامی کا اعتراف ہی کامیابی کی اصل قیمت ہے۔ جو لوگ یہ قیمت ادا نہ کریں وہ کبھی اس دنیا میں کامیابی کی منزل کو نہیں پہونچ سکتے۔

اس دنیا میں کامیابی کا راز صرف ایک ہے۔ یہ کہ آپ ناکامی کو وقتی واقعہ سمجھیں۔ ناکامی کو دوبارہ کامیابی میں بدلنے کے لیے آپ کبھی اپنا حوصلہ نہ کھوئیں۔

صحیح سبق

حضرت شفیق بلخی اور حضرت ابراہیم ادہم دونوں ہم زمانہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار شفیق بلخی اپنے دوست ابراہیم ادہم کے پاس آئے اور کہا کہ میں ایک تجارتی سفر پر جا رہا ہوں۔ سوچا کہ جانے سے پہلے آپ سے ملاقات کر لوں۔ کیوں کہ اندازہ ہے کہ سفر میں کئی مہینے لگ جائیں گے۔

اس ملاقات کے چند دن بعد حضرت ابراہیم ادہم نے دیکھا کہ شفیق بلخی دوبارہ مسجد میں موجود ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ تم سفر سے اتنی جلدی کیسے لوٹ آئے۔ شفیق بلخی نے بتایا کہ میں تجارتی سفر پر روانہ ہو کر ایک جگہ پہونچا۔ وہ ایک غیر آباد جگہ تھی۔ میں نے وہاں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں میں نے ایک چڑیا دیکھی جو اڑنے کی طاقت سے محروم تھی۔ مجھے اس کو دیکھ کر ترس آیا۔ میں نے سوچا کہ اس ویران جگہ پر یہ چڑیا اپنی خوراک کیسے پاتی ہوگی۔ میں اس سوچ میں تھا کہ اتنے میں ایک اور چڑیا آئی۔ اس نے اپنی چونچ میں کوئی چیز دبا رکھی تھی۔ وہ معذور چڑیا کے پاس اتری تو اس کے چونچ کی چیز اس کے سامنے گر گئی۔ معذور چڑیا نے اس کو اٹھا کر کھا لیا۔ اس کے بعد آنے والی طاقت ور چڑیا اڑ گئی۔

یہ منظر دیکھ کر میں نے کہا سبحان اللہ۔ خدا جب ایک چڑیا کا رزق اس طرح اس کے پاس پہونچا سکتا ہے تو مجھ کو رزق کے لیے شہر در شہر پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں سے واپس چلا آیا۔ یہ سن کر حضرت ابراہیم ادہم نے کہا کہ شفیق، تم نے اپاہج پرندے کی طرح بننا کیوں پسند کیا۔ تم نے یہ کیوں نہیں چاہا کہ تمہاری مثال اس پرندے کی سی ہو جو اپنے قوت بازو سے خود بھی کھاتا ہے اور اپنے دوسرے ہم جنسوں کو بھی کھلاتا ہے۔ شفیق بلخی نے یہ سنا تو ابراہیم ادہم کا ہاتھ چوم لیا اور کہا کہ ابو اسحاق، تم نے میری آنکھ کا پردہ ہٹا دیا۔ وہی بات صحیح ہے جو تم نے کہی۔

ایک ہی واقعہ ہے، اس سے ایک شخص نے بے ہمتی کا سبق لیا اور دوسرے شخص نے ہمت کا۔ اسی طرح ہر واقعہ میں بیک وقت دو پہلو موجود ہوتے ہیں۔ یہ آدمی کا اپنا امتحان ہے کہ وہ کسی واقعہ کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ایک زاویہ سے دیکھنے میں ایک چیز بری نظر آتی ہے، دوسرے زاویہ سے دیکھنے میں وہی چیز اچھی بن جاتی ہے۔ ایک رُخ سے دیکھنے میں ایک واقعہ میں منفی سبق ہوتا ہے اور دوسرے رخ سے دیکھنے میں مثبت سبق۔

مسائل اور مواقع

انگریزی کا ایک مثل ہے ـــــ مسائل کو بھوکا رکھو، مواقع کو کھلاؤ :

Starve the problems, feed the opportunities.

یہ ایک بہت بامعنی بات ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ جو شخص اس گہری حکمت کو جانے اور اس کو استعمال کرے وہی اس دنیا میں کامیاب ہوتا ہے جو شخص اس حکمت کو نہ جانے اور اس کو استعمال نہ کر سکے اس کے لیے ناکامی کے سوا اور کوئی چیز مقدر نہیں۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں آدمی ہمیشہ دو قسم کی چیزوں کے درمیان رہتا ہے۔ ایک مسائل اور دوسرے مواقع۔ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کچھ مسائل سے گھرا ہوا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمیشہ یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی کے قریبی ماحول میں کچھ قیمتی مواقع موجود ہوتے ہیں جن کو بھرپور استعمال کر کے وہ کامیابی کی منزل تک پہونچ سکتا ہے۔ یہ صورت حال ایک فرد کے ساتھ بھی پیش آتی ہے اور ایک پوری قوم کے ساتھ بھی۔

یہی وہ مقام ہے جہاں موجودہ دنیا لوگوں کا امتحان لے رہی ہے۔ جو شخص صرف اپنے مسائل کو دیکھے اور اس میں الجھ جائے وہ اپنے مواقع کو کھو دے گا۔ اس کے برعکس جو شخص مواقع کو دیکھے اور ان کو بھرپور استعمال کرے وہ مسائل میں زیادہ توجہ نہ دے سکے گا۔ مسائل کو "کھلانا" مواقع کو "بھوکا" رکھنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ اسی طرح جو شخص مواقع کو کھلائے وہ اس قیمت پر ہوگا کہ اس کے مسائل بھوکے رہ جائیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مواقع کو استعمال کرنے کے لیے ہمیشہ مسائل کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ مسائل میں الجھنا کبھی کسی کے لیے مفید نہیں ہوتا۔ آخری نتیجہ کے طور پر وہ صرف وقت کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہے۔ مگر جو شخص اپنے آپ کو مواقع کے استعمال میں لگاتا ہے وہ نہ صرف مواقع کا فائدہ حاصل کرتا ہے بلکہ اس کی کامیابی بالواسطہ طور پر اس چیز کو بھی حل کر دیتی ہے جس کو مسائل کہتے ہیں۔

خدا کا ذکر

من قیس بن ابی حازم قال کان عبد اللہ بن رواحۃ واضعًا راسہ فی حجر امراتہ فبکیٰ فبکت امرأتہ۔ قال مایبکیک قالت رأیتک تبکی فبکیت قال انی ذکرت قول اللہ عزوجل (وان منکم الا واردھا) فلا ادری انجو منھا ام لا۔ وفی روایۃ وکان مریضًا

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۱۳۲)

قیس بن حازم تابعی حضرت عبداللہ بن رواحہ صحابی کے بارہ میں بتاتے ہیں کہ وہ اپنا سر اپنی بیوی کے گود میں رکھے ہوئے تھے کہ وہ رو پڑے۔ ان کی بیوی بھی رونے لگیں۔ انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم کو کس چیز نے رلایا۔ بیوی نے کہا کہ میں نے آپ کو روتے ہوئے دیکھا تو میں بھی رونے لگی۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ قول یاد آیا کہ تم میں سے ہر شخص جہنم سے گزرے گا (مریم) تو مجھے نہیں معلوم کہ میں اس سے بچ جاؤں گا یا نہیں بچوں گا۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت حضرت عبداللہ بن رواحہ بیمار تھے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہیں۔ ایک جلیل القدر صحابی کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے جس کو شریعت میں "ذکر" کہا جاتا ہے۔ ذکر الفاظ کے ورد کا نام نہیں۔ وہ ایک معنوی طوفان کا نام ہے جو ایک بندے کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے رب کو یاد کرے۔

ایک شخص جو واقعۃً اللہ پر یقین رکھتا ہو وہ جب اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ اس کی عظمت سے دہل اٹھتا ہے۔ وہ اس کے سامنے پیشی کے تصور سے کانپنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کے اندر کی کیفیت بے اختیارانہ طور پر لفظوں کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔ یہی ذکر ہے۔ خدا کا ذکر خدا کو اپنے سینہ میں اتارنے کا نام ہے، ایسے خدا کو جس کی برداشت پہاڑ بھی نہیں کر سکتے۔ اس طوفان خیز لمحہ میں جو ربانی کلمات انسان کی زبان سے نکلتے ہیں انھیں کا نام ذکر ہے۔ ذکر خدا کو پانے کا نام ہے نہ کہ کسی قسم کے الفاظ کو پانے کا۔

موت

موت کیا ہے، موت معلوم دنیا سے نامعلوم دنیا کی طرف چھلانگ ہے۔ موت "اپنی دنیا" سے نکل کر "دوسرے کی دنیا" میں جانا ہے۔ کیسا چونکا دینے والا ہے یہ واقعہ۔ مگر انسان کی یہ غفلت کیسی عجیب ہے کہ وہ اپنے چاروں طرف لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے، پھر بھی وہ نہیں چونکتا۔ حالاں کہ ہر مرنے والا زبان حال سے دوسروں کو بتا رہا ہے کہ جو کچھ مجھ پر گزرا یہی تمہارے اوپر بھی گزرنے والا ہے۔

آدمی پر وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ کامل بے بسی کے ساتھ اپنے آپ کو خدا کے فرشتوں کے حوالہ کر دے۔ موت کا واقعہ ہر آدمی کو اسی آنے والے دن کی یاد دلاتا ہے۔

موت کا حملہ سراسر یک طرفہ حملہ ہے۔ یہ طاقت اور بے طاقتی کا مقابلہ ہے۔ اس میں انسان کے بس میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ کامل عجز کے ساتھ فریق ثانی کے فیصلہ پر راضی ہو جائے۔ وہ یک طرفہ طور پر شکست کو قبول کرلے۔

موت انسانی زندگی کے دو مرحلوں کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ موت آدمی کو موجودہ دنیا سے اگلی دنیا کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ اختیار سے بے اختیاری کی طرف سفر ہے۔ یہ امتحان کے بعد انعام پانے کے دور میں داخل ہونا ہے۔

موت سے پہلے کی زندگی میں آدمی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ معقولیت کے آگے جھکنے پر راضی نہیں ہوتا۔ موت اس لیے آتی ہے کہ اس کو بے یار و مددگار کر کے حق کے آگے جھکنے پر مجبور کر دے۔ جس صداقت کو اس نے باعزت طور پر قبول نہیں کیا تھا اس کو وہ بے عزت ہو کر قبول کرے۔ جس حق کے آگے وہ اپنے ارادہ سے نہیں جھکا تھا۔ اس حق کے آگے مجبورانہ طور پر جھکے اور اس کی تردید کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے۔

انسان آج حق کی تائید میں چند الفاظ بولنا گوارا نہیں کرتا، جب موت آئے گی تو وہ چاہے گا کہ ڈکشنری کے سارے الفاظ حق کی موافقت میں استعمال کر ڈالے، مگر اس وقت کوئی نہ ہوگا جو اس کے الفاظ کو سنے۔ انسان آج ڈھٹائی کرتا ہے، موت جب اس کو پچھاڑے گی تو وہ سراپا عجز و نیاز بن جائے گا، مگر اس وقت کوئی نہ ہوگا جو اس کے عجز و نیاز کی قدر دانی کرے۔

قدردانی

چارلس ڈارون (۱۸۸۲ - ۱۸۰۹) اپنے اسکول کے زمانہ میں اچھا طالب علم نہ تھا۔ اس کے والد نے ایک بار اس کو ڈانٹتے ہوئے کہا تھا کہ "تم بس شکار کھیلتے رہتے ہو اور کتوں کے ذریعہ چوہا پکڑنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے ہو" اسکول کی تعلیم کے بعد اس کے والد نے اس کو ڈاکٹری کے کورس میں داخل کیا مگر وہ ڈاکٹری کا کورس مکمل نہ کر سکا۔ اس کے بعد اس نے پادری بننے کا ارادہ کیا اور کیمبرج یونیورسٹی میں دینیات میں داخلہ لیا۔ مگر یہاں بھی وہ ناکام رہا۔

کیمبرج کے قیام کے زمانہ میں ڈارون کو تاریخ طبیعی (Natural history) کے موضوع سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ مضمون اگرچہ اس کے ڈگری کورس کے نصاب میں شامل نہ تھا۔ تاہم ذاتی شوق کے تحت وہ اس کو پڑھتا رہا۔ تاریخ طبیعی اور علم طبقات الارض سے دلچسپی نے ڈارون کو پروفیسر ہنسلو (J.S. Henslow) تک پہونچایا۔ پروفیسر ہنسلو نہایت علم دوست اور وسیع الظرف آدمی تھے۔ ان سے تعلق ہی ڈارون کے لیے پہلا زینہ تھا جس نے اس کو علم کی دنیا میں چوٹی کے مقام پر پہونچا دیا۔

اس زمانہ میں برطانی حکومت نے اپنے بحریہ کے ایک خاص دخانی جہاز کو جس کا نام بیگل (Beagle) تھا تحقیقات کی مہم پر روانہ کیا۔ یہ جہاز بحر الکاہل اور اٹلانٹک کے ساحلی ملکوں کا پانچ سال (۳۶ - ۱۸۳۱) تک سروے کرتا رہا۔ پروفیسر ہنسلو نے اپنے ذاتی اثرات سے کام لے کر ڈارون کو اس جہاز میں جگہ دلادی۔ ڈارون اس جہاز میں تاریخ طبیعی کے عالم (Naturalist) کے طور پر مقرر کر دیا گیا۔ اس طرح اس کو موقع مل گیا کہ دنیا کے مختلف حصوں کا عملی مشاہدہ کر سکے۔ ڈارون اس وقت بطور خود بیگل میں جگہ نہیں حاصل کر سکتا تھا۔ یہ صرف پروفیسر ہنسلو تھے جنھوں نے نوجوان ڈارون کی صلاحیت کو پہچانا اور اس کو اس تاریخی کشتی میں سفر کرنے کا موقع فراہم کیا۔

اس پانچ سالہ مدت میں ڈارون نے مختلف ملکوں کو دیکھا اور سواحل پر واقع جنگلوں اور پہاڑوں کے سفر کیے۔ کہیں پیدل اور کہیں گھوڑے پر وہ میلوں تک اندر گیا اور ہزاروں کی تعداد میں مختلف قسم کے پودوں اور جانوروں کا مشاہدہ کیا اور ان کے نمونے جمع کیے۔ ساتھ ہی اس نے پتھروں

میں محفوظ مختلف جانداروں کے باقیات (Fossils) کا ذخیرہ بھی اکٹھا کیا۔

اس سفر کے مشاہدات سے اس نے بہت سے نظریات قائم کیے۔ مثلاً یہ کہ مختلف اقسام کے حیوانوں ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود بہت سے پہلوؤں سے باہم مشابہت رکھتے ہیں۔ اسی طرح یہ کہ کوئی جاندار جس ماحول میں رہتا ہے وہ اس ماحول کی مناسبت سے اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہے، وغیرہ۔ بنیادی طور پر یہی وہ مشاہدات تھے جو مزید مطالعہ کے بعد ڈارون کے نظریۂ ارتقار کی صورت میں ڈھل گیے۔

راقم الحروف ذاتی طور پر ڈارون کے نظریۂ ارتقار کو سراسر وہم سمجھتا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ تاہم ڈارون کی زندگی میں یہ سبق ہے کہ "بڑوں" کی قدر دانی کس طرح "چھوٹوں" کو آگے بڑھاتی ہے اور ان کی صلاحیت کو نمایاں ہونے کا موقع دیتی ہے۔ جس معاشرے میں بڑے لوگ جوہر کی بنیاد پر افراد کی قدر دانی کریں وہاں افراد ترقی کریں گے اور جہاں ایسا ہو کہ وقت کے بڑے لوگ صرف اپنے حاضر باشوں اور خوشامد پرستوں کی قدر کرنا جانیں وہاں افراد کی صلاحیتیں مُرجھا کر رہ جائیں گی۔ ایسا معاشرہ کبھی اعلیٰ ترقی تک نہیں پہونچ سکتا۔

ڈارون کی زندگی کا ایک اور واقعہ بہت سبق آموز ہے۔ ڈارون کے ساتھ ایک عجیب اتفاق پیش آیا۔ ڈارون نے ۱۸۵۲ میں طبیعی انتخاب (Natural Selection) کے متعلق اپنے خیالات قلمبند کر لیے تھے مگر ابھی اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جون ۱۸۵۸ میں اس کو الفرڈ ویلیس (Alfred Wallace) کا ایک خط موصول ہوا۔ اس خط میں اس نے اپنے ایک غیر مطبوعہ مقالہ کا ذکر کیا تھا۔ اس مقالہ میں اس نے عین وہی بات لکھی تھی جو ڈارون نے اپنے مقالہ میں لکھ رکھی تھی۔ ڈارون یہ کر سکتا تھا کہ اولیت کا کریڈٹ لینے کے لیے وہ فوراً اپنے مقالے کو شائع کر دے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ اپنے اور ویلیس کے خیالات کو ایک مشترکہ مقالہ کی صورت میں لندن کی سوسائٹی (Lennean Society) کے سامنے پیش کرے تاکہ یہ نیا نظریہ لوگوں کے سامنے زیادہ طاقت اور اہمیت کے ساتھ لایا جا سکے۔ چنانچہ ۲۰ جون ۱۸۵۸ کو ارتقار کا نظریہ ایک مشترکہ مقالہ کی صورت میں لندن کے اہل علم کے اجتماع کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور فوراً ہی اہمیت کا موضوع بن گیا ـــــ اجتماعی عمل ہمیشہ زیادہ طاقتور ہوتا ہے، بشرطیکہ افراد اپنی انفرادی خواہشوں کو روکیں اور اجتماعی انداز میں کام کرنے کا حوصلہ کر سکیں۔

اعتراف نہیں

نئی دہلی کے ایک خاندان کو ٹیلی گرام ملا۔ اس کا مضمون یہ تھا :

Nani expired

یعنی نانی کا انتقال ہو گیا۔ یہ ٹیلی گرام پڑھ کر گھر کے سب لوگ پریشان ہو گیے۔ پورا خاندان فوری طور پر اس مقام کے لیے روانہ ہو گیا جہاں مذکورہ نانی رہتی تھیں اور جہاں سے ٹیلی گرام موصول ہوا تھا۔ یہ لوگ جب گھبرائے ہوئے اور کافی پیسہ خرچ کر کے مذکورہ مقام پر پہونچے تو وہاں نانی صاحبہ زندہ سلامت موجود تھیں۔

معلوم ہوا کہ ٹیلی گرام کا اصل مضمون یہ تھا کہ نانی پہونچ گئیں (Nani reached) مگر وہ موصول کرنے والے کلرک کی غلطی سے نانی انتقال کر گئیں (Nani expired) بن گیا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۶ دسمبر ۱۹۸۳)

ٹیلی گراف آفس کو اس افسوسناک غلطی کی طرف توجہ دلائی گئی۔ مگر اس کا جو نتیجہ ہوا وہ اخبار کے الفاظ میں یہ تھا :

The P&T department has not yet accepted the charge of inefficiency, regrets only the inconvenience, if any.

The Times of India, 7.12.1985

محکمہ ڈاک و تار نے اپنی غفلت تسلیم نہیں کی۔ اس نے صرف یہ کہا کہ اگر اس کی وجہ سے کوئی زحمت ہوئی ہو تو اس کو اس کا افسوس ہے۔

اوپر کی مثال صرف محکمۂ تار کی مثال نہیں، یہی موجودہ زمانہ میں تمام لوگوں کا حال ہے۔ "میں نے غلطی کی" صرف چار الفاظ کا ایک جملہ ہے مگر چار الفاظ کا یہ جملہ ادا کرنے والے چار انسان بھی مشکل سے آج کی دنیا میں ملیں گے۔ لوگوں کی ڈکشنری میں صرف یہ الفاظ ہیں کہ "تم غلطی پر ہو"۔ لوگوں کی ڈکشنری ان الفاظ سے خالی ہے کہ "میں غلطی پر ہوں"۔ آج کا انسان کسی قیمت پر اپنی غلطی کو نہیں مانتا، خواہ اس کی خاطر اسے حقیقت کو ذبح کرنا پڑے۔ خواہ ایک غلطی کو نہ ماننے کی کوشش میں وہ مزید بے شمار غلطیاں کرتا چلا جائے۔

انسان کی شخصیت

ایک برتن میں پانی ہے۔ اس سے ایک قطرہ ٹپکا۔ یہ قطرہ اگر بدبو دار ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ برتن کا سارا پانی بدبو دار ہے۔ پانی کا قطرہ پانی کے پورے ذخیرہ کا نمائندہ ہے۔ پانی کا ایک قطرہ جیسا ہے، سمجھ لیجئے کہ سارا پانی ویسا ہی ہوگا۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ ہر انسان گویا پانی کا ایک ذخیرہ ہے اس ذخیرہ سے بار بار اس کی بوندیں ٹپکتی رہتی ہیں۔ ان ظاہر ہونے والی بوندوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اندر کا انسان کیسا ہوگا۔ کسی آدمی سے آپ بات کریں اور بات چیت کے دوران اس کی زبان سے ایک ہلکی بات نکل جائے، کسی آدمی سے آپ معاملہ کریں اور معاملہ میں وہ کوئی کمزوری دکھائے، کسی آدمی کے ساتھ آپ کا سفر پیش آئے اور سفر میں اس کی طرف سے کوئی برا سلوک ظاہر ہو تو یہ اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ وہ آدمی اچھا آدمی نہیں۔

آدمی ایک مکمل مجموعہ ہے۔ جیسے برتن کا پانی ایک مکمل مجموعہ ہوتا ہے۔ کسی آدمی سے ایک کمزوری ظاہر ہو تو وہ اس کی شخصیت کا انفرادی یا استثنائی واقعہ نہ ہوگا بلکہ وہ اس کی پوری شخصیت کا اظہار ہوگا۔ وہ ایک عکس ہوگا جس میں اس کی پوری شخصیت جھلک رہی ہوگی۔ کوئی آدمی کسی معاملہ میں کمزور ثابت ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہ ہر معاملہ میں کمزور ہے۔ آدمی ایک معاملہ میں ناقابل اعتماد ثابت ہونے کے بعد ہر معاملے میں اپنے آپ کو ناقابل اعتماد ثابت کر دیتا ہے۔ اس کلیہ میں صرف ایک استثنار ہے اور وہ اس انسان کا ہے جو اپنا محاسبہ کرتا ہو۔ جس کے اندر احتساب کی صلاحیت زندہ ہو۔ جو بار بار اپنے اندر جھانک کر دیکھتا ہو کہ اس نے کیا صحیح کیا اور کیا غلط کیا۔ اس کی زبان کس موقع پر انصاف کی بات بولی اور کس موقع پر وہ انصاف سے ہٹ گئی۔

ایک شخص تجربہ میں غلط ثابت ہو۔ اس کے بعد اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ آپ سے معافی مانگے تو سمجھ لیجئے کہ وہ صحیح انسان ہے۔ وہ غلطی کر کے اس کی تصحیح کرنا جانتا ہے۔ مگر جس کا حال یہ ہو کہ اس سے قول یا فعل کی غلطی صادر ہو اس کے بعد اس کا ضمیر اسے نہ تڑپائے۔ اس کے اندر احتساب کی کیفیت نہ جاگے اور اس کی زبان معافی مانگنے کے لیے نہ کھلے تو ایسا انسان بالکل بے قیمت انسان ہے وہ اس قابل نہیں کہ اُس پر کسی بھی معاملہ میں بھروسہ کیا جا سکے۔

جانے بغیر بولنا

۲۲ دسمبر ۱۹۸۵ کا واقعہ ہے۔ میں کچھ ساتھیوں کے ہمراہ دہلی کا زو (چڑیا گھر) دیکھنے گیا۔ مختلف جانوروں کو دیکھتے ہوئے ہم اس مقام پر پہونچے جہاں آہنی کٹہرے کے اندر سفید شیر رکھا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے اس وقت شیر اپنے غار کے باہر ٹہل رہا تھا اور زائرین کو موقع دے رہا تھا کہ وہ اس کو بخوبی طور پر دیکھ سکیں۔

میں کٹہرے کے پاس دوسرے زائرین کے ساتھ کھڑا ہوا تھا کہ ایک صاحب کی پرجوش آواز کان میں آئی ـــــ "سفید شیر اب دنیا میں صرف یہی ایک ہے۔ مہاراجہ ریوا کے پاس دو سفید شیر تھے جو انھوں نے آزادی کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا کو دے دیے۔ ان میں سے ایک مرچکا ہے اور ایک باقی ہے جس کو ہم لوگ اس وقت دیکھ رہے ہیں۔"

مجھے اس وقت تک اس سلسلہ میں زیادہ معلومات نہ تھیں۔ میں ان کی بات سن کر آگے بڑھ گیا مگر چند قدم چلا تھا کہ کٹہرے کے پاس لگا ہوا بڑا سا بورڈ نظر آیا جس پر زو کے ذمہ داروں کی طرف سے سفید شیر کے بارے میں تفصیلی معلومات درج تھیں۔ یہ معلومات دو زبانوں (انگریزی اور ہندی) میں تھیں۔ میں نے اس کو پڑھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اس وقت دنیا میں کل ۶۹ سفید شیر پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ۲۵ سفید شیر صرف ہندستان میں ہیں۔ بورڈ میں ۶۹ سفید شیروں کی موجودگی کا ذکر تھا اور عین اس کے قریب ایک صاحب یہ اعلان کر رہے تھے کہ دنیا میں اس وقت صرف ایک سفید شیر پایا جاتا ہے۔ اور یہ واحد شیر دہلی کے زو کی ملکیت ہے۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جو یہ بتاتی ہے کہ لوگ حقیقتوں سے کتنا زیادہ بے خبر ہوتے ہیں اس کے باوجود وہ حقیقتوں کے بارہ میں کتنا زیادہ بولتے ہیں۔ آج کی دنیا میں یہ عام مزاج بن گیا ہے کہ آدمی باتوں کی تحقیق نہیں کرتا۔ اس کے باوجود وہ اس کو اپنا فطری حق سمجھتا ہے کہ وہ ہر موضوع پر بے تکان بولے، خواہ اس کے بارے میں اسے کچھ بھی واقفیت نہ ہو۔

کہنے سے پہلے جانیے۔ اظہار رائے سے پہلے تحقیق کیجیے۔ واقفیت کے بغیر بولنا اگر جہالت ہے تو تحقیق کے بغیر رائے ظاہر کرنا شرارت۔ اور دونوں یکساں طور پر برائی ہیں۔ ان میں اگر فرق ہے تو درجہ کا ہے نہ کہ نوعیت کا۔

مفاد پرستی

ایک لطیفہ ہے کہ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر جب یروشلم گئے تو اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم مناہن بیجن ان کو دیوار گریہ کے پاس لے گئے جو یروشلم میں یہودیوں کی مقدس ترین جگہ ہے۔ وہاں جمی کارٹر نے دعا کرتے ہوئے کہا اے خدا عربوں کو اور اسرائیل کو امن تک پہونچنے میں مدد کر۔" بیجن نے کہا "آمین"۔ اس کے بعد کارٹر نے دعا کی کہ خدایا، مصریوں کو اور اسرائیل کو پُر امن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی توفیق دے۔ بیجن نے کہا "آمین"۔ اس کے بعد جمی کارٹر نے دعا کی کہ خدایا، اسرائیلیوں کو بتا دے کہ وہ عربوں کو وہ تمام علاقے واپس کر دیں جن پر انھوں نے ۱۹۶۷ کی جنگ میں قبضہ کیا ہے۔ یہ سن کر بیجن نے کہا "جناب صدر، میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ ایک دیوار کو خطاب کر رہے ہیں"۔:

When former US president Carter visited Jerusalem, Israel's Prime Minister Begin took him to the Wailing Wall. "Oh God," Carter prayed, "please help the Arabs and Israelis to find peace."
"Amen," said Begin.
"And please, God, let the Egyptians and Israelis live in peaceful co-existence."
"Amen," said Begin.
"And please tell the Israelis to return to the Arabs all the territories they occupied in the 1967 War."
"I would like to remind you, Mr President," said Begin, "that you are talking to a wall."

Reader's Digest, May 1981

یہ صرف اسرائیلی وزیر اعظم کا لطیفہ نہیں، یہی موجودہ زمانہ کے تمام انسانوں کی تصویر ہے۔ لوگ انصاف کی باتیں کرتے ہیں مگر اس سے مراد صرف وہ انصاف ہوتا ہے جس کا فائدہ ان کی اپنی ذات کو مل رہا ہو، جو انصاف ان کی اپنی ذات کے خلاف فیصلہ دے اس سے لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔ لوگ دعاؤں پر آمین کہتے ہیں مگر ان کی آمین صرف اس دعا کے لیے ہوتی ہے جس کی زد دوسروں پر پڑ رہی ہو، جس دعا کی زد خود ان کے اپنے اوپر پڑے اس دعا کے اوپر کوئی آمین کہنے والا نہیں۔ لوگ حق پرستی کی باتیں کرتے ہیں مگر ان کی حق پرستی کا مطلب دوسروں پر اپنے حقوق ثابت کرنا ہے، جو حق انھیں ان کی اپنی ذمہ داریاں یاد دلائے اس حق کا آج کی دنیا میں کوئی خریدار نہیں۔

مغالطہ

کولن ولسن (Colin Wilson) انگریزی زبان کا شاعر تھا۔ اس کے خیالات بہت سخت تھے۔ اس کو بیسویں صدی کے سارے مغربی ادب کا انسان شکست خوردہ، مفلوج اور قنوطیت زدہ نظر آتا ہے۔ اس کے نزدیک آج کا انسان اس ذہنی مرض میں مبتلا ہے جس کو وہ (Fallacy of significance) یعنی بے اہمیتی کا مغالطہ کہتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کا زیادہ بڑا ذہنی مرض وہ ہے جو اس کے برعکس نفسیات پیدا کرتا ہے اور وہ اہمیت کا مغالطہ (Fallacy of insignificance) ہے۔ کچھ لوگ بعض تاریخی یا غیر تاریخی اسباب کے تحت اپنے آپ کو غیر ضروری طور پر اہم سمجھ لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ اپنے آپ کو صحیح طور پر سمجھ پاتے اور نہ دوسروں کے بارے میں حقیقت پسندانہ رائے قائم کرنے میں کامیاب ہوتے۔

بے اہمیتی کا مغالطہ ایک ذہنی مرض ہے۔ تاہم اس ذہنی مرض کا نقصان آدمی کی صرف اپنی ذات کو پہونچتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو فرضی طور پر غیر اہم سمجھ لے وہ اقدام سے گھبرائے گا۔ وہ کوئی بڑا کام کرنے کے لیے اپنے آپ کو نااہل سمجھے گا۔ وہ اپنی فعالیت کھو دے گا اور متحرک دنیا میں بے حس و حرکت پڑا رہے گا۔ مگر یہ سب ذاتی نقصان کی چیزیں ہیں۔ بے اہمیتی کے مغالطہ کی قیمت آدمی کو خود ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس کے برعکس مغالطہ کی دوسری قسم اس سے زیادہ سنگین ہے۔ بے اہمیتی کا مغالطہ اپنی ذات کے حق میں زہر ہے اور اہمیت کا مغالطہ پورے سماج کے حق میں زہر۔

اہمیت کے مغالطہ میں مبتلا ہونے والا آدمی اپنے آپ کو اس سے زیادہ سمجھ لیتا ہے جتنا کہ فی الواقع وہ ہے۔ وہ غیر واقعی طور پر اپنے کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کو جو درجہ دیتے ہیں وہ اس کو اس سے کم نظر آتا ہے جو اس کے اپنے نزدیک اس کا درجہ ہے۔ اس لیے دوسرے تمام لوگ اس کو ظالم نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے سوا ہر ایک کو برا سمجھنے لگتا ہے۔ وہ ہر ایک کا دشمن بن جاتا ہے۔ بے اہمیتی کا مغالطہ اگر آدمی کے اندر پست ہمتی پیدا کرتا ہے تو اہمیت کا مغالطہ آدمی کو جارح بنا دیتا ہے۔ اور جارحیت بلاشبہ سماج کے حق میں پست ہمتی سے زیادہ ہلاکت خیز ہے۔

قرآنی طریقہ

یا ایها الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر ذالک خیر واحسن تاویلا - الم تر الی الذین یزعمون انہم آمنوا بما انزل الیک و ما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ ویرید الشیطان ان یضلہم ضلالاً بعیدا (النساء ۶۰-۶۱)

اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اہل امر کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی چیز کے بارہ میں تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے اچھا ہے کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ رکھتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر ایمان لائے ہیں جو تمہارے اوپر اتری ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے اتاری گئی، وہ چاہتے ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں۔ حالاں کہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کا انکار کریں۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ وہ انھیں بھٹکا کر بہت دور کر دے۔

قرآن کی اس آیت کا ایک خاص پس منظر ہے جو تاریخ سے اور شانِ نزول کی روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس کو یہاں مختصراً بیان کریں گے۔

یہ آیت اسلامی تاریخ کے اس دور میں اتری جس کو مدنی دور کہا جاتا ہے۔ مدینہ کے ابتدائی دور میں اسلام کا مکمل اقتدار قائم نہ تھا۔ اس زمانہ میں ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی جس کے پاس لوگ اپنے باہمی جھگڑوں کے فیصلہ کے لیے آتے تھے۔ اسی کے ساتھ سابقہ روایت کے مطابق یہودی سرداروں کی گدیاں بھی اب تک قائم تھیں۔ جو لوگ چاہتے وہ اپنے جھگڑے ان کے پاس لے جاتے اور ان سے اپنے معاملہ میں فیصلہ لیتے۔ گویا وہاں تقریباً وہی صورت حال موجود تھی جس کا ایک نقشہ موجودہ ہندستان میں نظر آتا ہے۔ ہندستان میں ایک طرف اسلامی اداروں کے دار الافتار

ہیں جن سے مسلمان اپنے قضیوں کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہاں غیر مسلم عدالتیں ہیں جو ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرتی ہیں جو ان کے یہاں جائیں اور ان سے اپنے مقدمہ کا فیصلہ چاہیں۔

سورۂ نساء کی مذکورہ آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کے سلسلہ میں تفسیر کی کتابوں میں مختلف قصے نقل کیے گیے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نوعیت کے متعدد واقعات مدینہ میں پیش آئے۔ اس کے بعد قرآن میں یہ آیت اتری۔ ان میں سے ایک واقعہ کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

قدیم مدینہ میں بنو قریظہ اور بنو نضیر دو یہودی قبیلے تھے۔ بنو قریظہ نسبتاً کمزور قبیلہ تھا۔ اس کے مقابلہ میں بنو نضیر کو مال اور تعداد کے اعتبار سے زیادہ بڑی حیثیت حاصل تھی۔ بنو نضیر نے اپنی برتر حیثیت سے فائدہ اٹھا کر یہ اصول مقرر کرا لیا کہ اگر بنو قریظہ کا ایک آدمی بنو نضیر کے ایک آدمی کو قتل کرے تو قاتل کو قتل کیا جائے گا، یا وہ دیت کے طور پر ایک سو وسق کھجور ادا کرے گا۔ اس کے برعکس اگر بنو نضیر کا ایک آدمی بنو قریظہ کے آدمی کو قتل کرے تو قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس کو صرف دیت دینا ہوگا، اور دیت بھی ۶۰ وسق کھجور ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آئے تو دونوں یہودی قبیلوں کے کچھ افراد مسلمان ہو گیے۔ ان نومسلموں میں یہ واقعہ ہوا کہ بنو نضیر سے تعلق رکھنے والے ایک مسلمان نے بنو قریظہ سے تعلق رکھنے والے ایک مسلمان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد دونوں طرف کے لوگوں میں جھگڑا ہوا۔ بنو نضیر (اور اس کے حلیف قبیلۂ اوس) نے بنو قریظہ سے کہا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان پہلے سے طے ہے کہ ہمارا قاتل قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس کو صرف ۶۰ وسق کھجور بطور دیت دینا ہوگا۔ اس کے مطابق ہم تم کو ۶۰ وسق کھجور دینے کے لیے تیار ہیں۔ بنو قریظہ (اور ان کے حلیف قبیلہ خزرج) نے کہا کہ یہ وہ چیز ہے جو جاہلیت کے زمانہ میں رائج تھی۔ تم نے اپنی طاقت کے زور پر اس غیر منصفانہ اصول کو ہم سے منوا لیا تھا۔ مگر اب ہمارے درمیان اسلام آچکا ہے اور اسلام میں مساوات کا اصول ہے۔ یہاں ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے اب مساوی بنیاد پر فیصلہ ہوگا۔

جھگڑا بڑھا تو بنو قریظہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس چلو اور ان سے فیصلہ لے لو۔ انھیں یقین تھا کہ رسول اللہ ﷺ جو فیصلہ کریں گے وہ ان کے حق میں ہوگا۔ مگر بنو نضیر اس کے لیے راضی نہیں ہوئے۔ کیوں کہ انھیں اندیشہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے یہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ نہ لے سکیں گے۔ چنانچہ بنو نضیر نے کہا کہ

کعب بن اشرف (یہودی سردار) کے پاس چلو اور اس سے فیصلہ لو۔ اس پر یہ آیت اتری۔

سورہ نساء کی مذکورہ آیت میں ایک خاص بات دیکھنے کی یہ ہے کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے صرف مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے۔ اس میں یہودی عدالت کے خلاف کوئی بیان نہیں جہاں مدینہ کے یہ مسلمان اپنا فیصلہ لینے گئے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ قسم کے معاملہ میں اصلاح کا قرآنی طریقہ کیا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ ساری توجہ مسلمانوں کی اصلاح پر صرف کی جائے۔ کیوں کہ اس خرابی کا اصل سبب مسلمانوں میں ہے نہ کہ غیر مسلم عدالت میں۔

کوئی عدالت خود سے اقدام کرکے کسی کے معاملہ میں دخل نہیں دیتی۔ عدالت اپنا فیصلہ صرف اس وقت دیتی ہے جب کہ کوئی شخص اپنا فیصلہ لینے کے لیے اس کے یہاں جائے اور ان شہادتوں (Evidences) کی بنیاد پر فیصلہ کرتی ہے جو اس کے سامنے پیش کی گئی ہوں۔

مسلمان اگر غیر مسلم عدالت میں اپنا مقدمہ نہ لے جائیں تو غیر مسلم عدالت کو یہ موقع ہی نہ ملے گا کہ وہ مسلمانوں کے معاملہ میں اپنا فیصلہ دے۔ گویا اس طرح کے معاملہ میں غیر مسلم عدالت کے خلاف چیخ پکار کرنا اپنی غلطی کا الزام دوسرے کے سر ڈالنا ہے۔ اور اس قسم کا غیر منصفانہ عمل یقینی طور پر اسلامی اصول کے سراسر خلاف ہے۔ اس طرح کے معاملہ میں اصل قصوروار مسلمان ہیں نہ کہ غیر مسلم عدالت۔ اور جب قصوروار مسلمان ہیں تو دوسرے کے خلاف ہنگامہ کرنے سے کیا فائدہ۔

مذکورہ قرآنی طریقہ کی روشنی میں اب اس معاملہ کو جانچئے جو حال میں شاہ بانو اور محمد احمد (اندور) کے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد پیش آیا ہے۔ قرآن کے مطابق اس معاملہ میں مسلم قائدین کا اصل کام یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو ملامت کرتے کہ تم غیر مسلم عدالت میں کیوں اپنا مقدمہ لے جاتے ہو۔ تمہارے وہاں جانے ہی کی وجہ سے غیر مسلم عدالت کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ تمہارے عائلی معاملات میں اپنا فیصلہ دے۔ اس کے بجائے تم کو یہ کرنا چاہیے کہ تم اپنے مقدمات اپنے علماء کے سامنے پیش کرو اور وہ از روئے شریعت جو فیصلہ دیں اس کو مان لو۔ اس ملک میں کثرت سے دار الافتاء ہیں۔ امارت شرعیہ ہے۔ پھر تم ان کو چھوڑ کر غیر مسلم عدالت میں کیوں جاتے ہو۔ مسلم قیادت نے یہ اصل کام تو نہیں کیا۔ البتہ وہ سپریم کورٹ اور غیر مسلم حکومت کے خلاف ہنگامہ کرنے میں مصروف ہے۔ یہ طریقہ بلاشبہ قرآنی طریقہ نہیں۔ یہ لیڈری ہے نہ کہ قرآن کی پیروی۔

ایک سفر

دسمبر ۱۹۸۵ میں بماکو (افریقہ) میں ایک اسلامی کانفرنس ہوئی۔ اس موقع پر راقم الحروف نے ہندستان کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس سفر کا راستہ تھا: دہلی۔ روم۔ دکار۔ بماکو، دوسرے لفظوں میں ایشیا سے یورپ اور پھر یورپ سے افریقہ۔ کانفرنس کے بعد بماکو۔ پیرس۔ لندن۔ کویت۔ دبئی۔ دہلی کے راستہ سے واپسی ہوئی۔

بہت سے لوگوں کے لیے سفر ایک تفریح ہوتا ہے۔ مگر میرے لیے سفر ایک مصیبت ہے۔ چنانچہ میں گھر سے بادل ناخواستہ ایر پورٹ کے لیے روانہ ہوا۔ دلی ایر پورٹ پر پہونچ کر مجھے اس قدر وحشت ہونے لگی کہ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ واپس چلو، مجھے سفر پر نہیں جانا ہے۔ میرے قدم کسی طرح آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ مگر ساتھی کے اصرار اور دینی مصلحت کے خیال سے مجھے آگے جانا پڑا۔

میرے مزاج میں فطرت پسندی اتنی زیادہ ہے کہ مجھے ہر مشینی سفر سے وحشت ہوتی ہے۔ اگر پیدل سفر کرنا ممکن ہو تو یقیناً میں پیدل سفر کروں۔ مگر ظاہر ہے کہ ایشیا سے یورپ، اور یورپ سے افریقہ اور امریکہ کا سفر پیدل طے نہیں کیا جا سکتا۔

میری یہ کیفیت بھی عجیب ہے۔ جن دنیوی چیزوں کو پاکر عام لوگ خوش ہوتے ہیں ان کو پاکر میں ایسا غمزدہ ہوتا ہوں جیسے وہ چیز مجھے کاٹ رہی ہو۔ ۴ دسمبر ۱۹۸۵ کی رات کو پالم ایر پورٹ پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ لوگ خوش وخرم چہروں کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ مگر میں اپنے خیالات میں گم تھا۔ میرے ہاتھ میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ میرے لیے روم (اٹلی) اور دکار (سینیگال) میں ہوٹل کے کمرے رزرو تھے۔ بماکو (افریقہ) پہونچ کر مجھے فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کرنا تھا۔ مگر میرا حال یہ تھا کہ جیسے قدم اٹھ نہ رہے ہوں۔ آخر جب میں جہاز کے اندر داخل ہوا تو میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میرے دل کو ایک لمحہ کا سکون بھی حاصل نہ تھا۔

اللہ اپنے اس بندے پر رحم فرمائے جس کا حال یہ ہے کہ جہاں لوگ ہنستے ہیں وہاں اسے رونا آتا ہے۔ جہاں لوگ اپنے کو پایا ہوا سمجھتے ہیں وہاں اس کو ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیوی کامیابی پر قانع نہ ہونے والے آدمی کی اندرونی حالت اتنی مختلف ہوتی ہے کہ اس کو وہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے جو دنیوی کامیابی پر قانع ہو گیے ہوں۔

صبح کے ناشتہ کے وقت جہاز کے اندر ایر انڈیا کا مینو کارڈ دیا گیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا :

Indian hospitality across five continents

(ہندستانی میزبانی پانچ براعظموں کے درمیان) مطلب یہ ہے کہ ایر انڈیا کی سروس پانچوں براعظموں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا مسافر دنیا کے جس براعظم میں بھی جائے وہ ایر انڈیا کو اپنے لیے بہترین میزبان کے طور پر پائے گا۔

میں ناشتہ سے فارغ ہو کر ٹائلٹ جانے کے لیے اٹھا تو جہاز کے عملہ کے ایک شخص نے مسکراتے ہوئے کہا :

You enjoyed your breakfast, Sir.

(جناب، کیا آپ اپنے ناشتہ سے محظوظ ہوئے) ظاہر ہے کہ یہ سب تجارتی اخلاق کی باتیں ہیں۔ تاجر اپنی تجارت کے لیے کتنے خوبصورت الفاظ پا لیتا ہے۔ دین کی دعوت کو بھی قرآن میں ایک تجارت کہا گیا ہے۔ مگر دین کے داعی اپنے مدعو کے لیے موجودہ زمانہ میں خوبصورت الفاظ نہ پا سکے۔ ان کے پاس اپنے مدعو کو صرف متوحش کرنے والے الفاظ ہیں نہ کہ اس کو مانوس کرنے والے الفاظ۔

دہلی سے روم کا فاصلہ ۴۰۰۰ کیلو میٹر ہے۔ یہ دوری آٹھ گھنٹے میں طے ہوئی۔ ہم ۴ دسمبر کی صبح کو روم کے ہوائی اڈہ پر اترے۔ روم سے اگلا جہاز شام کو تھا۔ چنانچہ یہاں ایر انڈیا کی طرف سے ہمارے لیے ایک دن کے قیام کا انتظام تھا۔ یہاں میں ہوٹل (Holiday Inn) کے کمرہ نمبر ۲۲۷ میں ٹھہرا۔ یہاں میں نے تین نمازیں پڑھیں۔ فجر، ظہر، عصر۔

روم اٹلی کا دار السلطنت ہے۔ یہ دنیا کے انتہائی قدیم شہروں میں سے ہے۔ اس کا آغاز غالباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں ہوا۔ اس وقت یہاں صرف چند معمولی مکانات تھے۔ اس کے بعد رومیوں کی ترقی کے ساتھ روم کی ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ ایک عظیم شہر بن گیا۔ رومی اس کو ابدی شہر (Eternal City) کہتے تھے۔ روم کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس نے یورپ میں ایک ہزار سال تک تہذیب کے مقدر پر حکومت کی ہے :

For well over a millenium Rome controlled the destiny of all civilization known to European man, then fell into dissolution and disrepair. (15/1066)

روم کا ایر پورٹ کافی بڑا ہے۔ اس کو دیکھ کر روم کے بارے میں شاندار تصور ذہن میں آتا ہے۔ مگر حقیقت میں روم اتنا شاندار نہیں۔ جب شہر میں داخل ہوں تو اس کی آبادیاں دوسرے درجہ کے شہر کا منظر پیش کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ روم اب ایک زوال یافتہ شہر ہے جہاں زندگی کے ہر جزء پر تنزل کی چھاپ نظر آتی ہے۔ مشہور

رومی سیاست داں مارکس سسرو (Marcus Tillius Cicero) نے دو ہزار سال پہلے کہا تھا کہ بجٹ متوازن ہونا چاہیے، ورنہ حکومت دیوالیہ ہو جائے گی۔ مگر آج روم کی حکومت پر ۳۰۰ کرور روپئے سے زیادہ کا قرض ہے۔ اس قرض پر اس کو روزانہ تقریباً ایک کرور روپیہ کا سود ادا کرنا پڑتا ہے۔

تعلیم، واٹر سپلائی، اسپتال، ڈاک، ہر چیز کا نظام غیر معیاری ہے۔ ہم کو نیویارک سے دہلی کے لیے ٹیلی فون منٹوں میں مل گیا تھا۔ یہاں سے ہم نے دہلی ٹیلی فون کرنا چاہا مگر کافی کوشش کے بعد بھی سلسلہ نہیں ملا۔ روم میں بجلی کے بارے میں ایک میگزین میں یہ لطیفہ پڑھا کہ روم میں بجلی نہ اے سی ہے اور نہ ڈی سی ہے۔ وہ ایم سی ہے۔ یعنی خراب کرنٹ:

It is neither AC nor DC,
but MC Malfunctioning Current.

اسی طرح ایک اور لطیفہ پڑھنے میں آیا کہ روم کے ایک شخص کے نام ۶۷ ٹیلی فون کالوں کا بل آگیا جب کہ درخواست کے باوجود ابھی تک اس کے یہاں ٹیلی فون بھی نہیں لگا تھا۔

روم میں جرائم بھی کافی ہوتے ہیں۔ ایک فرانسیسی سیاح ایک مقام پر اپنی موٹر کار روک کر اترا۔ پولس نے اس کو ہدایت کی کہ وہ کار کے دروازے اچھی طرح بند کر دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ مگر جب وہ سیر کر کے واپس آیا تو اس کی کار کے سات سوٹ کیس چوری ہو چکے تھے۔ اس کے بعد وہ قریب کے پولس دفتر میں رپوٹ درج کرانے گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کی کار بھی غائب تھی۔

ایک سیاح نے بتایا کہ روم میں اس کا ایک مسئلہ پیدا ہوا تو ایک مقامی باشندے نے اس سے کہا:

Don't get upset. Rome is Rome. The key
word, my friends, is PAZIMENZA (patience)

پریشان نہ ہو میرے دوست، کلیدی لفظ صرف ایک ہے، اور وہ ہے برداشت۔

روم کی ایک خاص چیز ویٹیکن سٹی ہے۔ یعنی مسیحی پیشوا کا شہر۔ ویٹیکن سٹی رقبہ کے اعتبار سے ایک مربع میل سے بھی کم ہے۔ یہ دنیا کی سب سے چھوٹی ریاست ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بے حد چھوٹا ہونے کے باوجود وہ خود اٹلی سے بھی زیادہ ذی اثر ہے۔ وہ رومن کیتھولک چرچ کا عالمی مرکز ہے۔ ویٹیکن اٹلی کے اندر ہونے کے باوجود مکمل طور پر خود مختار ہے۔ مگر یہ خود مختاری اس کو اس قیمت پر ملی ہے کہ اس نے اپنے اختیارات کو غیر سیاسی دائرہ میں محدود کر لیا۔

ویٹیکن سٹی کا اپنا ٹیلی فون سسٹم ہے۔ اپنا پوسٹ آفس ہے۔ اپنا طاقت ور ریڈیو اسٹیشن ہے۔ اپنی پولس ہے۔ اپنا بینکنگ نظام ہے۔ اپنی کرنسی ہے۔ اس کے باشندے ایک ہزار سے بھی کم ہیں مگر ان کا اپنا علٰحدہ پاسپورٹ ہوتا ہے۔ یہ زیادہ تر چرچ کے عہدیدار اور کارکن مرد اور عورتیں ہیں۔ ویٹیکن میں بہت سے چرچ ہیں۔ ان میں سے قدیم ترین چرچ چوتھی صدی عیسوی کا بنا ہوا ہے۔ یہاں تقریباً ہر چیز باہر سے آتی ہے۔ مثلاً، کھانا، پانی، بجلی، گیس وغیرہ۔ یہاں کوئی انکم ٹیکس نہیں ہے۔

ویٹیکن سٹی کی آزاد اور خود مختار حیثیت مسولینی کی حکومت کے زمانے میں ۱۹۲۹ میں منظور ہوئی۔ یہاں کی لائبریری اور یہاں کے میوزیم میں بہت سے قیمتی نوادرات موجود ہیں جن کو دیکھنے کے لیے لوگ برابر آتے رہتے ہیں۔ ویٹیکن کا اپنا طاقت ور اطالوی اخبار ہے جس کا نام ہے *L'Osserva-tore Romano* یہاں کا پریس اتنا بڑا ہے کہ وہ ہر زبان میں کتاب چھاپ سکتا ہے۔ جارجیا کی قدیم زبان سے لے کر ہندستان کی تامل تک ہر زبان میں یہاں کتاب چھاپی جا سکتی ہے۔

سب سے پہلے سینٹ پال روم میں آئے اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ سینٹ پیٹر بھی روم آئے تھے۔ قرون وسطیٰ میں پوپ عملاً پورے یورپ کا مقتدر اعلیٰ تھا۔ وہ کسی بادشاہ کو معزول کرنے کا حق رکھتا تھا۔ مگر بعد کو بادشاہوں نے بغاوت کی یہاں تک کہ چرچ اور اسٹیٹ کی علٰحدگی عمل میں آئی۔ بادشاہ سیاست کا حکمراں قرار پایا اور پوپ مذہب کا۔ یورپ میں پوپ کا سیاسی اقتدار باقاعدہ طور پر ۱۸۷۰ میں ختم ہوا۔

ویٹیکن میں ایک اسلامی شعبہ بھی قائم ہے۔ اس شعبہ کے ذمہ دار کا نام و پتہ یہ ہے :

Rev. Fr. Thomas Michel
Secretariats pro Non-Christians
00120 Cittadel Vaticano
Roma; Italy

ویٹیکن پورے معنوں میں ایک "اسٹیٹ" ہے، صرف یہ کہ اس کے پاس باقاعدہ فوج نہیں۔ اس وقت دنیا بھر میں ۱۰۸ ملکوں سے اس کے سفارتی تعلقات ہیں۔ پچھلے پوپ عام طور پر ویٹیکن سے باہر نہیں نکلتے تھے مگر موجودہ پوپ بہت متحرک قسم کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کثرت سے بیرونی سفر کیے ہیں اور دوسری غیر روایتی سرگرمیاں دکھائی ہیں۔ انھیں میں سے ایک ہے : ویٹیکن کے دو حریفوں اینگلیکن چرچ اور اسلام سے تعلقات قائم کرنا۔ اگرچہ ایک مبصر کے الفاظ میں پوپ کو پہلے معاملے میں کامیابی ہوئی اور دوسرے معاملہ میں

ناکامی :

He initiated moves for a new relationship with Islam without success, and with the Anglican Church with success.

ہندستان میں عیسائیوں کی تعداد ۲ فی صد ہے۔ مگر دنیا بھر میں کیتھولک عیسائی تقریباً ایک ارب کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے تمام کیتھولک چرچ براہِ راست طور پر ویٹیکن کے ماتحت ہیں۔ ان کے تمام معاملات ویٹیکن کی ماتحتی میں انجام پاتے ہیں۔ چرچوں میں پادریوں کا تقرر، ان کا معاوضہ، ان کی ترقی یا عزل سب براہِ راست ویٹیکن کرتا ہے۔ صرف ہندستان میں گیارہ ہزار (Catholic priests) پادری ہیں اور وہ سب کے سب مکمل طور پر ایک بیرونی ادارہ (ویٹیکن) کے احکام کے تحت عمل کرتے ہیں۔ ویٹیکن اپنی ساری وسعت کے باوجود ایک انتہائی منظم عالمی ادارہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ اگر مسلمانوں کا ایسا کوئی ادارہ ہو تو غالباً اس کی ہر شاخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا کہ وہاں جس شخص کو مقامی انچارج بنایا جائے گا وہ پہلی فرصت میں یہ منصوبہ بنائے گا کہ قانونی یا غیر قانونی تدبیر کرکے اپنی زیر انتظام شاخ کو ایک الگ ادارہ بنالے اور آزادانہ طور پر خود اس کے اوپر قابض ہو جائے۔

مسلمانوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ ماتحتی کو قبول نہیں کرتے۔ اور بلاشبہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

دہلی اور روم میں وقت کا فرق ساڑھے چار گھنٹہ ہے۔ دہلی سے ہمارا جہاز دو بجے رات کو روانہ ہوا تھا۔ جب وہ روم پہونچا تو مقامی وقت کے لحاظ سے صبح ساڑھے چھ بجے کا وقت تھا، جب کہ اس وقت دہلی کی گھڑی میں دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دہلی کی گھڑی کے لحاظ سے ہم ساڑھے چار گھنٹہ پہلے روم پہونچ گئے ——— ہندستان سے مغرب کی طرف سفر کریں تو آپ وقت کو حاصل کرتے ہیں اور اگر ہندستان سے مشرق کی طرف سفر کریں تو آپ وقت کو کھو دیتے ہیں۔

۵ دسمبر کو میں دکار (سینیگال) پہونچا۔ روم سے دکار کا سفر ایر افریق (Air Afrique) کے ذریعہ ہوا۔ یہاں تقریباً ۲۰ گھنٹے قیام رہا۔ ہوائی سفر کا قاعدہ ہے کہ اگر آپ کو کسی مقام پر جہاز بدلنے کے لیے ٹھہرنا ہے اور آگے کی فلائٹ میں آپ کی سیٹ کنفرم ہے تو ہوائی کمپنی اپنے خرچ پر آپ کو ہوٹل میں ٹھہرائے گی۔ اور ہوائی اڈہ سے ہوٹل آنے جانے کے لیے سواری بھی اپنی طرف سے مہیا کرے گی۔ اس کے لیے ہوائی اڈہ

پر مستقل ڈسک ہوتے ہیں۔ روم کے ہوائی اڈہ پر یہ ڈسک پیسنجر سروس کے نام سے ہے اور دکار میں ایر افریق اور ایر فرانس کے نام سے۔ آپ یہاں اپنا ٹکٹ دکھا کر کاغذ بنوا لیجیے۔ اس کے بعد ہوٹل کے لوگ بطور خود آپ کا انتظام کریں گے۔ اگر وقت کافی ہو تو سفر کے آغاز سے پہلے ہی بذریعہ ٹیلکس ہوٹل کا رزرویشن ہو جاتا ہے۔

دکار میں میرا قیام ہوٹل میریڈین (Meridien) کے کمرہ نمبر ۴۵۶۹ میں تھا۔ یہ ہوٹل وسیع پہاڑی ماحول میں قائم ہے۔ ہوا نہایت خوش گوار ہے۔ یہاں نماز پڑھتے ہوئے دعا نکلی : خدایا میں نے تیرے آگے ایشیا میں سجدہ کیا تھا۔ پھر میں نے یورپ میں تیرے آگے سجدہ کیا اور اب افریقہ میں تیرے آگے سجدہ کر رہا ہوں۔ تو میری نمازوں کو قبول فرما اور مجھے بخش دے۔

دکار سینیگال کی راجدھانی ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ لوگ یا تو فرانسیسی زبان بولتے ہیں یا مقامی زبان۔ تاہم عربی اور انگریزی بولنے والے بھی بقدر ضرورت مل جاتے ہیں۔ یہاں موریطانیہ کے ایک صاحب ملے۔ وہ وہاں ریڈیو اور ٹیلی وژن کے محکمہ میں کام کرتے ہیں۔ وہ عربی اچھی جانتے تھے اور میری کتاب (الاسلام یتحدیٰ) سے واقف تھے۔

دکار (Dakar) افریقہ کے چند اہم شہروں میں سے ایک ہے۔ سمندر کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے اس کو ترقی کے کافی مواقع ملے ہیں۔ ۱۹۰۴ سے ۱۹۵۹ تک وہ فرانس کے قبضہ میں رہا۔ ۱۶۷۷ میں پہلی بار فرانسیسی یہاں سمندر کے راستہ سے داخل ہوئے تھے۔ سینیگال میں تقریباً ۹۰ فی صد مسلمان ہیں۔ دکار کی آبادی ایک ملین کے لگ بھگ ہے۔

دکار کا ہوٹل میریڈین عین سمندر کے کنارے ہے اور نہایت وسیع رقبہ میں رزورٹ کے انداز میں بنایا گیا ہے۔ اس کے ایک طرف دور تک پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب مناظر ہیں اور دوسری طرف سمندر کی لہریں موجیں مارتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ گویا ایک طرف جمالِ خداوندی کے مناظر ہیں اور دوسری طرف جلالِ خداوندی کے۔ مگر لوگوں کے چہرے بتاتے ہیں کہ وہ یہاں صرف تفریح کے لیے آتے ہیں۔ انھوں نے یہاں نہ خدا کے جمال کو دیکھا اور نہ اس کے جلال کا مشاہدہ کیا۔

ڈچ نے ۱۶۱۷ء میں یہاں کا ایک چھوٹا جزیرہ خرید کر حاصل کیا تھا۔ اس وقت سے یہاں مغربی تدخل کا آغاز ہوا۔ فرانسیسیوں نے اس جزیرے پر ۱۶۷۷ میں قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد یہاں برطانی آئے۔ بالآخر فرانسیسیوں نے اس کا بڑا حصہ ۱۸۵۷ میں فتح کیا۔ ۱۸۸۵ میں یہاں پہلی ریلوے قائم کی گئی۔ دکار کا صدارتی محل

دنیا کے چند خوبصورت ترین صدارتی محلوں میں سے ہے۔ دکار کا یوف ایر پورٹ (Yof Airport) امریکہ کی مدد سے بنایا گیا ہے۔ یہاں مونگ پھلی کافی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم تک یہاں کی مونگ پھلی تیل تیار کرنے کے لیے فرانس جاتی تھی۔ اب خود ملک میں اس کے کارخانے کھل گیے ہیں۔ دوسری بہت سی صنعتیں بھی یہاں پائی جاتی ہیں۔ نہر سوئز بند ہونے کے زمانہ میں دکار کی بندرگاہ کی تجارتی سرگرمیاں کافی بڑھ گئی تھیں۔ دکار اپنی قدرتی خوبصورتی کی وجہ سے سیاحوں کا مرکز ہے۔

دکار میں جب ہم مقررہ وقت پر ہوٹل سے ایر پورٹ پہونچے تو معلوم ہوا کہ کسی تکنکی سبب (Technical Reason) سے جہاز مزید لیٹ ہوگیا ہے۔ دوبارہ ہم ایک اور ہوٹل میں لے جائے گیے جس کا نام ہوٹل ترنگا (Hotel Sofitel Teranga) تھا۔

ہوٹل کے نام میں "ترنگا" کا لفظ دیکھ کر ہمیں ہندستانی لفظ ترنگا یاد آیا۔ جس کے معنی ہیں تین رنگ والا۔ مگر مقامی زبان میں اس لفظ کا مطلب ہے تکریم۔ ہوٹل ترنگا کا مطلب ہے عزت و تکریم والا ہوٹل۔

دوبارہ جب میں دکار کے ایر پورٹ پر پہونچا تو یہاں گامبیا کے ایک صاحب (احمد ڈرامے) سے ملاقات ہوئی۔ ان سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ آج جب کہ میں یہاں دکار کے ایر پورٹ پر تھا۔ دکار کا ایک آدمی آیا۔ وہ آپ سے ملنا چاہتا تھا، اس کو کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ آپ آج یہاں سے گزر رہے ہیں۔ اس نے آپ کی عربی کتابیں اور مجلہ الامۃ (قطر) میں آپ کے بارہ میں مضمون پڑھا تھا۔ میں نے جب بتایا کہ میں آپ کو جانتا ہوں اور آپ سے ملا ہوں تو وہ بہت حیرت کے ساتھ مجھ سے آپ کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ وہ دیر تک ایر پورٹ پر رہا۔ پھر مایوس ہو کر چلا گیا۔ واضح ہو کہ ہوائی جہاز لیٹ ہو جانے کی وجہ سے اس وقت میں ہوٹل ترنگا میں تھا۔ یہاں میرا قیام کمرہ نمبر ۲۰۳ میں تھا۔

دکار کے ہوائی اڈہ پر دو امریکی مسلمانوں (سلیم بن غانم، حسن عجرم) سے ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں اصلاً لبنانی ہیں۔ مگر ان کے آبا امریکہ میں رہنے لگے۔ یہ لوگ اب صرف انگریزی زبان جانتے ہیں۔ اپنی آبائی زبان عربی سے برائے نام واقف ہیں۔

ان کو میں نے الرسالہ (انگریزی) دیا۔ وہ اس کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ اس کے مضامین پڑھتے جاتے تھے اور "گڈ، گڈ" کہتے جاتے تھے۔ الرسالہ (انگریزی) کی زبان کی انھوں نے خاص طور پر بہت تعریف کی۔

انھوں نے کہا کہ امریکہ میں اسلام کے تعارف کے لیے ہمیں انگریزی کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔ اس وقت انگریزی میں جو کتابیں دستیاب ہیں وہ زیادہ تر ان لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں جو اسلام کو سیاسی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ انداز امریکیوں کو زیادہ اپیل نہیں کرتا۔ ہمیں ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جس میں اسلام کو اس کے فطری اور ابدی انداز میں پیش کیا گیا ہو۔ میں نے تعارفی سٹ (انگریزی) کا ذکر کیا۔ انھوں نے اس سے بہت دل چسپی ظاہر کی۔ انشاء اللہ ان کو انگریزی کا تعارفی سٹ بھیج دیا جائے گا۔

دکار ایرپورٹ پر کئی غیر مسلم یورپی ملے۔ وہ بماکو جا رہے تھے۔ ایک صاحب اٹلی کے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا مضمون جیالوجی ہے۔ وہ ایک پروجکٹ میں مدد کرنے کے لیے اکسپرٹ کے طور پر بماکو جا رہے ہیں۔

اکثر افریقی ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مگر یہ ممالک مستقل طور پر اپنی پسماندگی کی قیمت مغربی اقوام کے تدخل کی صورت میں ادا کر رہے ہیں۔ اولاً مغربی قوموں نے افریقہ میں سیاسی غلبہ حاصل کیا۔ اس کے بعد جب آزادی کا وقت آیا تو انھوں نے افریقی عوام کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر ان کو چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم کر دیا۔ اب وہ تکنکی ماہرین اور مسیحی مبلغین کے ذریعہ یہاں نفوذ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے قائدین اس کو ظلم سے تعبیر کریں گے مگر حقیقۃً یہ اپنی پسماندگی کی قیمت ہے جو افریقہ مسلسل ایک یا دوسری صورت میں ادا کر رہا ہے۔

دکار سے بماکو کے لیے ایر افریق سے روانگی ہوئی۔ جہاز میں ایر ہاسٹس نے کھانے کے لیے پوچھا۔ یہ غالباً افریقہ کی عیسائی خاتون تھی۔ میں نے کہا کہ "ویجیٹیرین"۔ وہ اچھی انگریزی جانتی تھی مگر ویجیٹیرین کا لفظ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کیوں کہ یہاں کثرت سے لوگ گوشت کھاتے ہیں، میں نے کئی بار دہرایا تو اس نے حیرت کے ساتھ کہا:

Oh, you are vegetarian!

(اف، آپ سبزی خور ہیں)

ہم ۶ دسمبر کی صبح کو بماکو (Bamako) پہونچے۔ یہاں ہوٹل میں حسب معمول طرح طرح کی چیزیں پک رہی تھیں۔ شرکاء اجتماع میں سے ایک صاحب زیور کی الماری کے سامنے کھڑے ہو گیے اور اپنے بچوں کے لیے زیور خریدنے لگے۔ یہ ایک افریقی عالم تھے اور عربی اچھی جانتے تھے۔ ان سے میری کافی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ میں نے کہا کہ ایسے بن جائیے کہ آپ کو صرف آیات اللہ نظر آئیں۔ یہ چیزیں آپ کو دکھائی نہ دیں جو آیات الانسان کی حیثیت رکھتی ہیں۔

انھوں نے کہا کہ یہ میں بچوں کے لیے لے رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ اپنے بچوں کو بھی ویسا ہی بنائیے جیسا آپ کو بننا ہے وہ ہنس کر کہنے لگے "آپ تو ابوذر غفاری ہیں، ہم لوگ ایسے کہاں بن سکتے ہیں"

۶ دسمبر ۱۹۸۵ کی صبح کو ہم ایر افریق کے ذریعہ بماکو پہونچے۔ بماکو مالی کی راجدھانی ہے۔ یہ سفر وقفہ کے لحاظ سے میرے تمام سفروں میں سب سے زیادہ طویل تھا۔ ۳ دسمبر کا دن گزار کر رات کو میں نے عشار کی نماز دہلی میں پڑھی تھی۔ اس کے بعد برابر سفر میں رہا۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر کو فجر کی نماز بماکو میں پڑھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ نومبر ۱۹۸۵ کے تیسرے ہفتے میں امریکہ میں تھا۔ وہاں سے واپسی کے جلد ہی بعد دسمبر کے پہلے ہفتہ میں یورپ سے گزرتے ہوئے افریقہ آنا ہوا۔ اس تین ہفتہ کے اندر میں نے اپنی نمازیں چار بر اعظموں (امریکہ، ایشیا، یورپ، افریقہ) میں ادا کیں۔ اس طرح گویا خدا کی زمین کے بیشتر حصہ میں خدا کے آگے سجدہ کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ اپنی مغفرت کی دعا کے بعد دوسری دعا جو دل سے نکلتی رہی وہ یہ تھی کہ خدایا، بھٹکے ہوئے لوگوں کی ہدایت کا سامان فرما۔

مالی کا رقبہ ۱۲۴۰۰۰۰ مربع کیلومیٹر ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۷۰ کی مردم شماری کے مطابق تقریباً ستر لاکھ ہے۔ بماکو اس کی راجدھانی ہے۔ یہ ملک ۱۸۹۸ سے لے کر ۱۹۶۰ تک فرانس کے زیر قبضہ رہا۔ اب وہ آزاد ہے مالی بنیادی طور پر زرعی ملک ہے۔ اس کا تقریباً نصف حصہ صحرا ہے۔ یہاں کا سب سے بڑا دریا نائجر ہے۔ ۹۰ فی صد آبادی زراعت پیشہ ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان ابھی تک فرانسیسی ہے۔ آبادی میں تقریباً ۸۰ فی صد مسلمان ہیں۔ عیسائیوں کی تعداد صرف ۲ فی صد ہے۔ یہاں کے لوگ گیارہویں صدی عیسوی میں مسلمان ہوئے۔ بماکو کی آبادی تقریباً چھ لاکھ سترہ ہزار ہے۔ تعلیم دس فی صد ہے۔ مالی میں لوہا پیدا ہوتا ہے۔ وہ ملک میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ باکسائٹ، مینگنیز، فاسفورس وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ سونا بھی ملتا جاتا ہے۔ تاہم ذریعہ آمدنی زیادہ تر زراعت اور مچھلی ہے۔ مچھلی نائجر دریا سے حاصل کی جاتی ہے۔ ریل صرف ۴۰۰ میل تک ہے زیادہ تر روڈ سے سفر کیا جاتا ہے۔ یہاں کی حکومت کا نظام جمہوری ہے۔ مالی کا انحصار فرانس کی مدد پر رہا ہے اب عرب ملکوں سے بھی اس کو کافی امداد مل رہی ہے۔ مالی مغربی افریقہ میں واقع ہے۔ اس کو سمندری کنارہ حاصل نہیں۔

بماکو میں میرا قیام ہوٹل (Hotel Sofitel L'Amitie) میں تھا۔ میرے کمرہ کا نمبر ۷۱۲ تھا۔ میرا مزاج کچھ اس قسم کا ہے کہ "در و دیوار" سے مجھے انس نہیں ہوتا۔ خواہ وہ تعمیراتی اعتبار سے کتنے ہی

شاندار کیوں نہ ہوں۔ البتہ فطرت کے مناظر ہوں تو ان سے میں فوراً مانوس ہو جاتا ہوں۔ میرے کمرے کے ایک طرف حسب معمول در و دیوار تھے مگر دوسری جانب دور تک سرسبز و شاداب مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں کی سب سے بڑی ندی نائجر سامنے سے گزر رہی تھی اور اس کے چاروں طرف درختوں کی ہریالی نظر آتی تھی۔ دیوار سے دیوار تک لگے ہوئے شیشوں کے ذریعہ میں ہر وقت انھیں دیکھ سکتا تھا۔ یا کمرہ کے باہر بالکنی میں جا کر ان کا ہم نشین بن سکتا تھا۔ خدا کی مخلوقات میں خدا دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگ مخلوقات میں صرف مخلوقات ہی کو دیکھ پاتے ہیں۔ ان کی نظر اس سے آگے نہیں جاتی۔

مالی میں مختلف عرب ملکوں کے تعاون سے بڑے بڑے کام ہو رہے ہیں۔ بماکو میں سعودی عرب کی امداد سے ایک مسجد بنائی گئی ہے جو یہاں کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ ۶ دسمبر کو ہم نے جمعہ کی نماز اسی مسجد میں پڑھی۔ یہ مسجد ایک بہت بڑے ہال کی مانند ہے۔ ہال کا اندرونی حصہ ۸۰ اونچے اونچے کھمبوں پر کھڑا کیا گیا ہے۔ پوری مسجد بالکل جدید انداز میں بنائی گئی ہے۔ جمعہ کے خطبہ کے لیے عام طور پر الگ ممبر ہوتے ہیں جن سے مسجد کے آگے کا ایک حصہ گھرا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں ممبر کی صورت یہ ہے کہ دیوار کے اوپری حصہ میں اس کے لیے جگہ نکالی گئی ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے دیوار میں بہت بڑا طاق بنا دیا جائے جس میں آسانی سے آدمی کھڑا ہو سکے۔ اس "طاق" کے نچلے حصہ میں بالکنی کی مانند تھوڑا سا حصہ آگے کی طرف نکلا ہوا ہے اور اس پر ریلنگ کے انداز میں گھیرا بنا دیا گیا ہے۔

عرب ملکوں کے ذریعہ اس قسم کے بے شمار کام ساری دنیا میں ہو رہے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انتظام ہے جو اس نے موجودہ زمانہ میں اسلام کو زندہ رکھنے کے لیے کیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیڈروں کے شاندار الفاظ کے باوجود مسلمان زمانہ کے لحاظ سے آج اتنا پیچھے جا چکے تھے کہ اگر "پٹرو ڈالر" کی خدائی طاقت ظاہر نہ ہوئی ہوتی تو مسلمان موجودہ زمانہ میں بین اقوامی اچھوت بن کر رہ جاتے۔

دہلی اور بماکو میں وقت کا فرق ساڑھے چھ گھنٹہ ہے۔ بارہ بجے رات کو جب بماکو کے کیلنڈر میں ایک تاریخ ختم ہو کر دوسری تاریخ شروع ہوتی ہے، اس وقت دہلی میں ابھی کیلنڈر بدلنے کے لیے ساڑھے چھ گھنٹے کی مدت باقی رہتی ہے۔ اگر آپ ایک مقام کی گھڑی دوسرے مقام پر بغیر بدلے ہوئے پہنے رہیں تو آپ مقامی وقت کے لحاظ سے چھ گھنٹہ آگے یا چھ گھنٹہ پیچھے رہیں گے۔

یہاں کناڈا کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کو ہمارا انگریزی الرسالہ برابر جا رہا ہے۔ ان

سے میں نے انگریزی الرسالہ کے بارہ میں دریافت کیا تو انھوں نے اس کے مضامین کے بارہ میں بہت اچھے تاثر کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا :

Very simple, very effective

(بہت سادہ اور بہت اثر انگیز) ایک صاحب کینیا سے آئے تھے۔ ان کو بھی انگریزی الرسالہ جارہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں کم از کم دس آدمی پابندی سے آپ کا انگریزی الرسالہ پڑھتے ہیں۔ ان کو ایک رسالہ کے بعد دوسرے رسالہ کا انتظار رہتا ہے۔ اور یہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو انگریزی زبان سے بہت اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔

یہاں کی اسلامی کانفرنس میں ایک صاحب سوئزرلینڈ سے آئے تھے۔ ان کو بھی انگریزی الرسالہ برابر جارہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے یہاں کئی لوگ اس کو پابندی سے پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے اس کے زبان و بیان کا پرزور الفاظ میں اعتراف کیا۔ مزید انھوں نے بتایا کہ سوئزرلینڈ میں ایک صاحب انگریزی الرسالہ کے اتنا زیادہ قدرداں ہیں کہ انھوں نے اس کے کئی مضامین کو ٹیپ پر منتقل کیا اور اس کو وہاں کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر کرایا۔

میں اپنے ساتھ کتابیں نہیں لے گیا تھا۔ میرے ساتھ صرف عربی کتاب (الدین فی مواجہۃ العلم) کے چند نسخے تھے اور انگریزی الرسالہ کی چند کاپیاں تھیں۔ میں نے دیکھا کہ جس سے بھی کتاب یا رسالہ کا ذکر آیا وہ بے حد شوق اور احترام کے ساتھ اس کو لیتا تھا اور چاہتا تھا کہ پورا سٹ اسے مل سکے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں بے شمار لوگ اسلام کو وقت کے اسلوب میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر آج اسلامی مرکز کے سوا غالباً کوئی بھی ادارہ نہیں جو اسلام کی تعلیمات کو جدید عصری اسلوب میں پیش کر رہا ہو۔ بعض لوگ اسلام کو سیاسی اسلوب میں پیش کرتے ہیں اور غلطی سے سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کو عصری اسلوب میں پیش کر رہے ہیں۔ حالاں کہ عصری اسلوب سائنٹفک اسلوب کا نام ہے نہ کہ سیاسی اسلوب کا۔

کانفرنس میں ویسٹ انڈیز کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی مادری زبان انگریزی ہے۔ انھوں نے ڈاکٹریٹ تک کی تعلیم امریکہ میں حاصل کی ہے۔ وہ انگریزی الرسالہ سے واقف نہ تھے۔ ان کو انگریزی الرسالہ کا ایک شمارہ (نومبر ۱۹۸۵) دیا گیا۔ انھوں نے رات کو سونے سے پہلے پورا رسالہ پڑھ ڈالا۔ اس کے بعد بار بار تقاضا کرتے رہے کہ یہ رسالہ میں مستقل طور پر پڑھنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے بہ تکرار وعدہ لیا کہ میں انھیں

انگریزی الرسالہ روانہ کروں گا۔

ان سے میں نے انگریزی الرسالہ کے بارے میں ان کا تاثر پوچھا تو انھوں نے کہا :

It is a very impressive and relevant piece of literature about Islamic realities.

(یہ اسلامی حقیقتوں کے بارہ میں ایک بے حد موثر اور بہت متعلق ادب پارہ ہے) موصوف گیانا کے اسلامک سنٹر کے ڈائرکٹر ہیں۔

افریقہ کا مشہور تاریخی شہر تمبکتو (Tumbukto) اسی مالی میں واقع ہے۔ تمبکتو چودھویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں صدی عیسوی تک اس علاقہ میں اسلامی تعلیم اور اسلامی ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ تمبکتو کی بنیاد غالباً ۱۱۰۰ء میں پڑی۔ ابتداءً اس نے تجارتی مرکز کی حیثیت سے ترقی کی۔ اس کے بعد وہ ثقافتی اور علمی مرکز بن گیا۔ یہاں قدیم زمانہ میں کئی اسلامی یونیورسٹیاں قائم تھیں جن میں علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کے طلبہ آتے تھے۔ تمبکتو کی مرکزی حیثیت ۱۵۹۱ء میں ختم ہوئی جب کہ وہ مراکو کے قبضہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد وہاں بار بار انقلابات آتے رہے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۸۵ کے لیے ایک ہوائی جہاز چارٹر کیا گیا تھا اور کانفرنس کے تمام شرکاء اس کے ذریعہ تمبکتو کو دیکھنے کے لیے جانے والے تھے۔ مگر بعض وجوہ سے مجھے جلد دہلی پہونچنا تھا اس لیے میں تمبکتو کے سفر میں شریک نہ ہو سکا اور ۹ دسمبر کی شام کو بماکو سے دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔

۹ دسمبر ۱۹۸۵ کو یہاں کا اسلامی مرکز دیکھا۔ بماکو کا یہ اسلامی مرکز شارع زائد بن سلطان پر واقع ہے وہ ۲۵ ہزار مربع میٹر کے رقبہ میں پانچ ملین ڈالر کے خرچ سے بنایا گیا ہے۔ اس کا فنڈ عرب ملکوں نے ادا کیا ہے۔ یہاں کی مسجد میں میں نے دو رکعت نماز ادا کی۔

کانفرنس کے تمام شرکاء اجتماعی طور پر مرکز میں لے جائے گئے تھے۔ یہ مرکز ابھی بن کر تیار ہوا ہے۔ تاہم ابھی اس میں کام نہیں شروع ہوا ہے۔ لوگ گھوم گھوم کر شاندار مرکز کے مختلف حصے دیکھ رہے تھے اور پرجوش طور پر باتیں کر رہے تھے۔ میں خاموش اپنے خیالات میں کھویا ہوا ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس دوران ایک افریقی عالم استاذ احمد درامے میرے پاس آئے اور مسکراتے ہوئے میرے بارہ میں کہا :

يُعجبُ الناس بالمباني ويُعجبُ الشيخ بالمعاني

موجودہ زمانہ میں اس طرح کے بڑے بڑے اسلامی مراکز دنیا کے ہر حصہ میں بنائے گیے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ ایک المیہ یہ ہے کہ وہ بالواسطہ یا براہ راست طور پر حکومتوں کے عطیہ سے بنتے ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام پسند طبقہ کا بڑا حصہ اسلام کی سیاسی تفسیر سے متاثر ہے۔ وہ جگہ جگہ مسلم حکومتوں کے خلاف سیاسی انقلاب کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے۔ چنانچہ یہ لوگ مسلم حکومتوں کی نظر میں معتوب یا کم از کم مشتبہ ہو گیے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنی جھوٹی سیاست نہ چلاتے تو یہ تمام مراکز ان کے قبضہ میں ہوتے اور ان سے وہ دعوت اسلامی کا زبردست کام لیتے۔ مگر اپنی سیاست پسندی کی وجہ سے وہ یا تو ان مراکز سے محروم ہیں یا اگر کہیں کوئی مرکز ان کے ہاتھ آ گیا ہے تو اس کو اپنے غلط قسم کے سیاسی ذہن کی وجہ سے مفید نہیں بنا پاتے۔

مالی کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ نوآبادیاتی دور میں جن مقامات پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا وہاں کے اعلیٰ طبقوں میں انگریزی زبان رائج ہو گئی۔ اسی طرح جن علاقوں میں فرانس کی حکومت تھی وہاں کے اونچے طبقوں کی زبان فرانسیسی ہو گئی۔ یہ صورت حال اب بھی جاری ہے جب کہ انگریز اور فرانسیسی ان علاقوں سے بہت پہلے سیاسی طور پر واپس جا چکے ہیں۔ یہاں کے عوام علاقائی زبان بولتے ہیں۔ مگر خواص کی زبان ابھی تک انگریزی اور فرانسیسی ہے۔

یہی معاملہ قدیم زمانہ میں عربی زبان کے ساتھ ہوا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جب شمالی افریقہ فتح ہوا تو اس کے بعد مسلمان سمندر کو پار کر کے اسپین اور سسلی میں داخل ہوئے۔ یہاں انھوں نے صرف حکومت نہیں کی بلکہ ایک شاندار تہذیب کی بنیاد ڈالی جو اس وقت کی عیسائی دنیا سے بہت زیادہ آگے تھی۔ چنانچہ ان علاقوں کے عیسائی کثرت سے عربی لکھنے اور بولنے لگے۔ غیر مسلموں نے اس زمانہ میں عربی زبان اور عربی علوم میں اتنی مہارت پیدا کی کہ ٹامس براؤن (Thomas Brown) جو انگلستان کا ایک عیسائی تھا وہ اسلامی عہد میں سسلی کے اندر قاضی مقرر کیا گیا۔

پھر جب اس علاقہ سے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوا تو اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک اسپین اور سسلی کا اعلیٰ طبقہ عربی زبان بولتا رہا۔ اور عدالتوں اور دفتروں میں عربی زبان رائج رہی۔ اگرچہ عوام کی علاقائی زبان عبرانی اور لاتینی تھی مگر خواص کی زبان بدستور عربی ہی بنی رہی۔

برٹرینڈ رسل نے سسلی میں مسلم عہد کے بعد عربی زبان اور تہذیب کے غلبہ کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :

Greek and Arabic were still living languages in Sicily. Frederick learnt to speak six languages fluently (including Arabic). He was at home in Arabian philosophy, and had friendly relations with Mohammadans.

A History of Western Philosophy p. 436

بماکو کی اسلامی کانفرنس کا افتتاح ۶ دسمبر ۱۹۸۵ کی شام کو ہوا۔ افتتاح کی تقریب میں مالی کے وزیر خارجہ، وزیر داخلہ، وزیر تعلیم اور دوسرے بہت سے ذمہ دار موجود تھے۔ اس کانفرنس میں تین زبانیں رائج تھیں ـــــ عربی، انگریزی اور فرانسیسی۔ اس میں دنیا کے مختلف حصوں سے نمایندہ افراد شریک ہوئے۔ چنانچہ کویت کے نمایندہ نے تقریر کی تو انھوں نے اپنی تقریر میں یہ الفاظ استعمال کیے :

اتینا من مشارق الارض ومن مغاربها

اس کانفرنس میں حسب ذیل ملکوں کے اہلِ علم مسلمان شریک تھے : کناڈا، مالی، قبرص، یونان، سعودی عرب، مالدیپ، سوئزرلینڈ، میڈاگاسکر، انگلینڈ، شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ، برازیل، سوڈان، کینیا، ہندستان، ترکی، کویت، پاکستان، گیانا، شام، فلپائن، فلسطین، غانا، گامبیا، ہالینڈ، یوگوسلاویہ، افغانستان، کوریا، تیونس، نائجریا، یمن، جاپان۔

کانفرنس میں زیادہ تر دو قسم کے امور پر تقریریں اور مباحثے ہوئے، ایک اسلامی دعوت، دوسرے اسلام یا مسلمانوں پر دوسری قوموں کے حملے۔ تاہم کانفرنس پر دوسرا موضوع زیادہ نمایاں رہا۔ ہر علاقہ کے لوگوں نے اپنے اپنے علاقے کی مشکلات بیان کیں۔ خاص طور پر وہ مشکلات جو صہیونیت، کمیونزم اور جدید استعمار کی طرف سے پیدا کی گئی ہیں۔

دعوت کا موضوع زیادہ تر دفاعی طور پر سامنے آیا۔ موجودہ زمانہ میں مسیحی مبلغین کافی سرگرمی کے ساتھ مسلمانوں پر کام کر رہے ہیں۔ پوپ نے پچھلے چند برسوں میں چار بار افریقہ کا سفر کیا ہے۔ مسیحی چرچ نے طے کیا ہے کہ مسلمانوں کے بڑے حصہ کو یا تو مسیحی بنا دیا جائے اور اگر وہ مسیحی بننے پر راضی نہ ہوں تو ان کے ذہن کو اس طرح بدل دیا جائے کہ اپنے مذہب میں ان کی فکری جڑیں باقی نہ رہیں۔ وہ نہ مسلمان ہوں اور نہ عیسائی۔

کانفرنس کے شرکاء کا عام احساس یہ تھا کہ چرچ کے لوگ جتنے منظم طور پر اپنا دعوتی کام کرتے ہیں اتنے منظم طور پر مسلمان اپنا دعوتی کام نہیں کر رہے ہیں۔ اس لیے اسلامی دعوت کے کام کو زیادہ منظم اور زیادہ موثر بنانے کی ضرورت ہے۔

کانفرنس میں اس موضوع پر کافی گفتگو ہوئی کہ افریقہ میں مسیحی مبلغین مسلمانوں کو عیسائی بنا رہے ہیں۔ اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ ایک افریقی نمائندے نے بتایا کہ مسلمانوں میں مسیحی تبلیغ کی کامیابی کی اصل وجہ مسلمانوں کا افلاس ہے۔ افریقہ کے بہت سے حصوں میں زندگی بے حد سخت ہے۔ لوگوں کے پاس لباس اور مکان تک نہیں۔ مسیحیت قبول کرکے انھیں یہ سب چیزیں مل جاتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم سب کچھ کھو چکے ہیں۔ پھر کیا حرج ہے اگر ہم دین کو بھی کھو دیں (فقدنا كل شئ فلا باس اذا فقدنا الدين لان المسألة الآن مسألة البقاء والانقراض من الحياة)

بتایا گیا کہ یہی وجہ ہے کہ مذہب بدلنے کے تمام واقعات صرف دیہاتی علاقوں میں ہوتے ہیں جہاں افلاس زیادہ ہے۔ شہروں میں کوئی مسلمان مذہب نہیں بدلتا۔ کیوں کہ وہاں مذہب بدلے بغیر آدمی اپنے لیے اسباب معاش پالیتا ہے۔ مادی محرک کے تحت عیسائی ہوجانے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ جو مسیحیت قبول کرتے ہیں وہ بعد کو دوبارہ مسلمان ہوجاتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ تبدیلی مذہب کی اصل وجہ مادی افلاس نہیں بلکہ ذہنی افلاس ہے۔ اسلامی شعور نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے (كل هذا ناتج عن فقدان الوعي الاسلامي) ان کا خیال تھا کہ ہم کو سب سے زیادہ افریقی مسلمانوں، خاص طور پر دیہات کے مسلمانوں، کی تعلیم پر زور دینا چاہیے۔ یہ لوگ اگر تعلیم یافتہ ہوجائیں تو اپنے آپ اس قسم کے فتنوں سے بچ جائیں گے۔

ایک عرب عالم نے بتایا کہ یورپ کے ایک شخص کو اسلام کا مطالعہ کرایا گیا۔ مطالعہ کے بعد اس نے کہا: اے وہ جس کے پاس سچا دین ہے کاش اس کے پاس مردان کار بھی ہوتے (ياله من دين لو كان له رجال) یہ ایک حقیقت ہے کہ آج آسمان کے نیچے اسلام ہی واحد سچا دین ہے مگر اس کے حامل مسلمان اس قدر بے جان ہوچکے ہیں کہ ان کے بل پر کوئی حقیقی کام کرنا ممکن نہیں۔ مسلمانوں کی مثال دیمک زدہ لکڑی کی ہے۔ دیمک زدہ لکڑی سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔

ایک مصری عالم نے مسلمانوں کی حالت کا مرثیہ پڑھتے ہوئے کہا کہ مسلمان اس کے عادی ہوگئے ہیں کہ آج زمین میں دانہ ڈالیں اور کل سے پہلے اس کے پھل کی امید کریں (تعود المسلمون ان يبذروا البذرة اليوم ويرجون الثمرة قبل امس) تاہم انھوں نے کہا کہ ہمیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔ ہمیں اس اندیشہ سے بیٹھ نہیں جانا چاہیے کہ ہمیں ناکامی ہوگی (لا يجب ان نصاب بالشلل للحذر خشية

الفشل)

افغانستان کے نمائندہ نے بتایا کہ افغانستان اگرچہ ایک چھوٹی قوم ہے مگر اس کا جذبہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارا جہاد صرف افغانستان کو آزاد کرنے پر ختم نہیں ہوگا۔ بلکہ افغانستان کو آزاد کرانے کے بعد ہم سرحد کو پار کر کے آگے بڑھیں گے اور ان مسلمانوں کو بھی آزاد کرائیں گے جو روسی سرحد کے اندر ہیں اور اشتراکی حکومت کے غلام بنے ہوئے ہیں۔

افسوس کی یہ بات مجھے خوش نہ کر سکی۔ کیوں کہ جوش کی یہ قسم وہ ہے جو مسئلہ کو صرف بڑھاتی ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں مسئلہ کو ختم کرنے والی نہیں بنتی۔

ایک بار چند آدمیوں کے درمیان دنیائے اسلام کی موجودہ حالت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک عرب عالم نے کہا کہ آج مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کے معاملات کی قیادت جاہلوں کے ہاتھ میں ہے نہ کہ عالموں کے ہاتھ میں (قیادۃ امور المسلمین فی ایدی الجهلة لا فی ایدی العلماء)

یہ بات بذات خود صحیح ہے۔ مگر فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کبریٰ موت الکبرائی کا معاملہ ہے۔ یعنی حقیقی علم والے لوگ موجود نہیں ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کے معاملہ کے ذمہ دار وہ لوگ ہو گیے ہیں جن کے پاس جہالت کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ قیادت کے اعتبار سے علم والے وہ لوگ ہیں جو ایک طرف کتاب وسنت سے بخوبی واقف ہوں، اسی کے ساتھ وہ زمانہ کے تقاضوں کو پوری طرح جانتے ہوں۔

میرا مزاج یہ ہے کہ میں بولتا کم ہوں اور سنتا زیادہ ہوں۔ کانفرنس میں بھی میں ایسا ہی کر رہا تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ دوسروں کے مقابلہ میں کم بولتے ہیں۔ میں نے کہا:

I am trying to be a good listener

(میں کوشش کر رہا ہوں کہ میں اچھا سننے والا بنوں) موجودہ زمانہ کی مسلم جماعتوں میں صرف تبلیغی جماعت میں یہ مزاج پایا جاتا ہے کہ اس کے افراد یہ جانتے ہیں کہ چپ رہنا اور دوسرے کی بات سننا بھی ایک کام ہے۔ ورنہ ہماری اکثر جماعتوں کے افراد کو صرف یہ معلوم ہے کہ انھیں مسلسل بولنا چاہیے، حتی کہ اس وقت بھی جب کہ چپ رہنا ان کے لیے فرض کے درجہ میں ضروری ہو گیا ہو۔

ایک صاحب نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اس وقت ساری دنیا میں تقریباً ۱۰ ملین پناہ گزیں (لاجئین)

ہیں ۔ یعنی وہ لوگ جو ظلم وستم کی وجہ سے اپنے وطن کو چھوڑنے پر ہوئے ہیں (معزز مقرر خود بھی ایک پناہ گزین تھے جو اپنے وطن کو چھوڑ کر اب یورپ کے ایک ملک میں رہتے ہیں) پناہ گزینوں کی اس تعداد میں تقریباً سات ملین مسلمان ہیں ۔ نصف ملین پناہ گزیں اس وقت صرف سوڈان میں موجود ہیں ۔ ایک صاحب نے اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے پرجوش انداز میں کہا :

Why they are refugee? Because they are fighting for Islam.

(یہ لوگ کیوں پناہ گزیں ہیں ، اس لیے کہ وہ اسلام کی خاطر لڑ رہے ہیں)

یہ سب سے بڑی غلط فہمی ہے جس میں موجودہ زمانہ کے تمام مسلمان مبتلا ہیں ۔ وہ دنیا بھر میں اپنے قومی مقاصد کے لیے لڑائی لڑ رہے ہیں اور اس کو جہاد کہتے ہیں ۔ مزید یہ کہ یہ لڑائیاں بھی بے فائدہ لڑائیاں ہیں، کیوں کہ وہ حقیقی تیاری کے بغیر لڑی جا رہی ہیں ۔ اس قسم کی جھوٹی لڑائیوں کو اسلامی جہاد کہنا میرے نزدیک اسلامی جہاد کے لفظ کی سخت ناقدری کرنا ہے ۔

ایک ادارہ کے ذمہ دار نے بتایا کہ ان کے ادارہ میں ایک معمر خاتون آئیں اور کہا کہ میں حج پر جانا چاہتی ہوں ۔ مگر میرے پاس سفر خرچ کی رقم نہیں ہے ۔ آپ لوگ میرے لیے سفر خرچ کا انتظام کر دیں تاکہ میں حج کے لیے جا سکوں ۔ خاتون سے کہا گیا کہ جب آپ کے پاس سفر خرچ نہیں ہے تو شرعی طور پر آپ کے اوپر حج فرض بھی نہیں ہے، پھر آپ کیوں اس کے لیے سوال کر رہی ہیں ۔ خاتون نے جواب دیا :

میں سترہ سال سے برابر ہر سال حج کے لیے جا رہی ہوں ، پھر اس سال میں کیوں اس سے محروم رہوں ۔

جب اسلام اپنی حقیقی شکل میں باقی نہ رہے تو اسی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں ۔

اسلام کا اصل ہتھیار دعوت ہے ۔ یہی اس کی سب سے بڑی قوت ہے ۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان اگرچہ دعوت کو بالکل بھول گیے ہیں ۔ تاہم اسلام اپنے زور پر برابر لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے ۔ ہالینڈ کے بارہ میں ایک تقریر میں وہاں کے مسلمانوں کے حالات بتائے گیے ۔ اس سلسلہ میں مقرر نے جو تفصیلات پیش کیں ان میں یہ بھی تھا کہ ہالینڈ کے شہر اوترخت (Utrecht) میں ایک اجتماع ہوا ۔ اس اجتماع میں یورپ اور امریکہ کے کئی مسلمان شریک ہوئے ۔ اجتماع کے دوران ایک نشست ہوئی جس میں مسیحی چرچ کے نمائندوں نے بھی شرکت کی ۔ اس سلسلہ میں مقرر نے جو کچھ کہا اس میں یہ الفاظ بھی تھے :

وقد شاركت الكنيسة في حوار جرى في هذا الملتقى حول العلاقة بين المسيحية

والاسلام ۔ وقد اعلن احد المهندسین البلجیکیین اسلامہ فی ھذا الملتقیٰ
اس اجتماع کے دوران مسیحی چرچ نے بھی ایک نشست میں شرکت کی۔ اس میں مسیحیت اور اسلام کے تعلق کے بارہ میں ڈائیلاگ ہوا۔ اس موقع پر بلجیم کے ایک عیسائی انجینیر نے اسلام قبول کرلیا۔ انھوں نے مزید بتایا کہ اجتماع کے بعد ہالینڈ کے ایک گاؤں میں بہت سے عیسائی اسلام میں داخل ہوگیے۔

اسلام کی دعوت اسلام کی سب سے بڑی قوت ہے۔ مگر اسلام کے علم بردار اس کی اسی قوت کو موجودہ زمانہ میں سب سے کم استعمال کر رہے ہیں۔

افریقہ کے ایک صاحب نے بتایا کہ ممباسا کے ایک عیسائی نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد اس نے سواحلی زبان میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کا نام ہے: میں نے مسیحیت کو کیوں چھوڑا۔

اس کتاب میں مذکورہ نومسلم نے بتایا کہ انجیل کے مطابق مسیح نے فرمایا کہ میں یہود کے لیے آیا ہوں۔ اس کے برعکس محمدؐ نے فرمایا کہ میں ساری دنیا کی طرف بھیجا گیا ہوں ــــ اسلام عالمی اپیل کے لیے اپنے اندر کس قدر زیادہ سامان رکھتا ہے۔ مگر مسلمان اپنے چھوٹے چھوٹے قومی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہ اسلام کے عالمی اظہار کے لیے موجودہ زمانہ میں کچھ نہ کرسکے۔

بماکو سے واپسی میں ایک فرانسیسی انجینیر سے ایرپورٹ پر ملاقات ہوئی اس نے اپنا نام بانار (Barnar) بتایا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک گفتگو رہی۔ میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ میں بائبل پڑھتا ہوں اور اس پر عقیدہ رکھتا ہوں مگر میں چرچ نہیں جاتا۔ میں نے پھر پوچھا کہ کیوں، اس نے کہا کہ، اس لیے کہ بائبل اور چرچ میں تضاد پایا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی کوئی مثال دیجیے۔ اس نے کہا: مثلاً بائبل میں بت بنانا سختی سے منع کیا گیا ہے مگر چرچ میں آپ جائیے، تو وہاں آپ دیکھیں گے کہ بت بنابنا کر رکھے ہوئے ہیں۔ حضرت مسیح کی ابنیت کے بارہ میں اس نے کہا کہ مسیح حقیقی معنوں میں خدا کے بیٹے نہیں تھے۔ بیٹے کے لفظ کو میں تمثیلی مانتا ہوں نہ کہ حقیقی۔ اسی طرح کی باتیں دیر تک ہوتی رہیں۔

امریکہ سے آنے والے ایک صاحب نے بتایا کہ ۸۵-۱۹۸۴ میں ایتھوپیا میں قحط کا مسئلہ پیدا ہوا تو امریکی حکومت نے ابتداءً اس میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ مگر بعد کو یہ مسئلہ اخبارات میں بہت زیادہ نمایاں ہوا۔ مختلف ملکوں نے اس مد میں بڑی بڑی رقمیں دیں۔ اس کے بعد یہ مسئلہ امریکہ کے لیے ساکھ کا مسئلہ بن گیا کیوں کہ امریکہ عالمی قیادت کا دعویدار ہے اور اتنے بڑے انسانی مسئلہ میں حصہ نہ لینا اس کی قیادت کو

نقصان پہونچانے کا سبب بنتا۔

چنانچہ امریکی وزیر خارجہ جارج بش نے ایتھوپیا کی امداد کے لیے کام کرنے والی بعض انجمنوں کے ذمہ داروں کو بلایا جس میں مسلمان بھی شامل تھے۔ جارج بش نے ایتھوپیا کے قحط زدگان کی امداد کے لیے امریکی حکومت کی طرف سے ایک بلین ڈالر کا چیک اس طرح لکھا کہ اس کی پوری کارروائی ٹیلی وژن پر نشر کی جارہی تھی اور پریس کے ۲۰ نمائندے وہاں موجود تھے تاکہ امریکہ کی اس فیاضی کو کل صبح کے اخبارات کی سرخی بنا سکیں۔

بہت سے کام آدمی کرتا ہے جو بظاہر خیر اور اصلاح کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر یہ سارا کام محض اپنی قیادت کو باقی رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ قیادتی مصلحت کے سوا اس سے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا۔

ایک عرب عالم نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر دردمندانہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنا کام ہمیشہ چوٹی سے شروع کرتے ہیں (مع الاسف، المسلمون یبدؤن من القمة) یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی کام تکمیل کے مرحلہ تک نہیں پہونچتا۔ کام کی تکمیل کی لازمی شرط یہ ہے کہ وہ نیچے سے شروع کیا جائے نہ کہ اوپر سے ——— افسوس کہ یہ کمزوری آج دنیا بھر کے مسلمانوں میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔

کانفرنس کے بعد واپسی پیرس اور لندن کے راستہ سے ہوئی۔ بماکو سے روانہ ہوکر ۱۰ دسمبر ۱۹۸۵ کو میں پیرس پہونچا۔ پیرس سے آگے کے لیے میرا رزرویشن کنفرم نہیں تھا۔ کھڑکی پر متعین خاتون کو میری سیٹ کے لیے آدھ گھنٹہ سے زیادہ کام کرنا پڑا۔ ٹیلی فون، ٹیلکس اور کمپیوٹر میں وہ بہت دیر تک مشغول رہی۔ مزید یہ کہ پیرس سے دہلی براہ راست فلائٹ نہ ملنے کی وجہ سے راستہ بدلنا پڑا۔ اس کی وجہ سے اس کو بار بار حساب کتاب کرنا پڑا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ نہ اکتائی اور نہ اس کے اندر جھنجلاہٹ پیدا ہوئی۔ بالآخر اس نے برٹش ایرویز کی لندن سے دہلی کی فلائٹ پر میرے لیے جگہ حاصل کرلی۔ اس سارے کام میں کافی دیر ہوچکی تھی۔ چنانچہ میں بھاگ کر برٹش ایرویز کے جہاز تک پہونچا۔ جب میں جہاز کے اندر داخل ہوا تو اچانک یاد آیا کہ میں اپنا کتابوں کا بنڈل مذکورہ کھڑکی پر چھوڑ آیا ہوں۔ میں نے جہاز کے عملہ سے کہا۔ انھوں نے کہا کہ آپ اپنی سیٹ پر بیٹھیے۔ ہم ابھی آپ کا پیکٹ منگاتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جہاز کے اندر سے ٹیلی فون پر مذکورہ خاتون سے کہا۔ اس نے فوراً میرا پیکٹ بھیجا۔ پیکٹ مجھ کو جہاز کے اندر عین اس وقت مل گیا جب کہ جہاز روانہ ہونے والا تھا۔

اس پورے واقعہ کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ سب کچھ اتنے معیار اور اتنی مستعدی کے ساتھ ہوا کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا کو جس چیز کی ضرورت

ہے وہ "بہتر نظام" نہیں ہے بلکہ روح کی غذا ہے جس سے آج کا انسان محروم ہے۔ اسلام کو روح کی غذا کی حیثیت سے پیش کرنا ہی آج دعوتِ اسلامی کا اصل کام ہے۔

پیرس سے لندن تک ایر فرانس کے ذریعہ سفر ہوا۔ لندن سے دہلی کے لیے برٹش ایرویز کے ذریعہ روانگی ہوئی جہاز کے اندر برٹش ایرویز کا ماہنامہ تھا۔ اس کا نام انھوں نے اونچی زندگی (Highlife) رکھا ہے۔ اسی طرح اس کے صفحہ ۱۳۸ پر سیکو گھڑی کا اشتہار تھا۔ اس میں گھڑی کی تصویر کے ساتھ یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے :

Man invented time. Seiko perfected it.

(انسان نے وقت ایجاد کیا۔ سیکو نے اس کو معیاری حیثیت دی) آدمی کو جب کسی کام سے دلچسپی ہو تو وہ اسی طرح اپنی بات کہنے کے لیے خوبصورت الفاظ پا لیتا ہے۔ بڑے الفاظ بولنا ہمیشہ صرف اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ آدمی جس معاملہ میں بول رہا تھا اس معاملہ سے اس کو کوئی قلبی لگاؤ نہ تھا۔

برٹش ایرویز کے اندر جب مسافروں کو لاؤڈ اسپیکر پر ہدایات دی گئیں تو سب سے پہلے عرب خاتون کی زبان سے عربی میں اعلان کیا گیا۔ اسی طرح مختلف اعلانات عربی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ مثلاً ٹائیلٹ میں حسب ذیل اعلان اس طرح لکھا ہوا تھا کہ انگریزی کی لائن نیچے تھی اور عربی کی لائن اوپر :

الرجاء عدم رمي المناشف المستعملة في المرحاض

جہاز کے اناؤنسر نے دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ہمارے عملہ میں انگریزی، جرمن، فرنچ، اسپینی، عربی، اردو اور پنجابی جاننے والے لوگ موجود ہیں۔ آپ کسی بھی ضرورت کے لیے ان سے اپنی زبان میں کہہ سکتے ہیں۔ یہ اعلان سن کر میں نے سوچا کہ برٹش ایرویز کو بین اقوامی سطح پر اپنی تجارت چلانا ہے اس لیے اس نے اپنے عملہ میں ہر زبان کے آدمیوں کا انتظام کیا ہے۔ مگر عالمی اسلامی دعوت کا جذبہ اتنا موثر نہ ہو سکا کہ ہمارے کسی اسلامی ادارہ کے اندر ہر زبان کے جاننے والے فراہم کیے جائیں تاکہ ہر زبان کے جاننے والے ان سے اسلام کا تعارف حاصل کر سکیں۔ شاید دنیوی محرک انسان کے لیے اُخروی محرک سے زیادہ طاقت ور ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اسلام صرف ایک قوم کے لیے آیا تھا تو تمام مسلمان اس سے لڑ جائیں گے۔ مگر عملاً تمام مسلمان اسلام کو ایک قوم کی چیز بنائے ہوئے ہیں۔

۱۱ دسمبر ۱۹۸۵ کی صبح کو میں دہلی واپس پہونچا۔

1 الرسالہ کو خدا کے فضل سے یہ خصوصیت حاصل ہے کہ جو لوگ اس کی ایجنسی چلاتے ہیں وہ مقصدی تعلق کے تحت چلاتے ہیں۔ مثال کے طور پر پونہ کے ایک صاحب عرصہ دراز سے ایجنسی کے طور پر ۳۵ پرچے منگا رہے ہیں مگر وہ کوئی کمیشن نہیں لیتے۔ وہ ہمیشہ پوری قیمت روانہ کر دیتے ہیں۔ ان کو اس سلسلہ میں خط لکھا گیا تو انھوں نے جواب دیا ـــــ ۱۲۶۰ روپیوں کا ڈرافٹ حاضر خدمت ہے۔ جیسا کہ میں نے وعدہ کیا ہے کہ کمیشن میں نہیں لوں گا۔ آج بھی میں اپنے وعدہ کا پابند ہوں۔ مجھے کمیشن نیلی چھتری والے سے ملے گا۔ انشاء اللہ میں اسی سے لوں گا۔

(۱۶ دسمبر ۱۹۸۵)

۲۔ آسٹریلیا کی ایک مسلم تنظیم نے انگریزی کی تعارفی کتابوں کا سٹ ڈیڑھ سو کی تعداد میں منگوا کر آسٹریلیا کے ایک "یوتھ فیسٹیول" کے موقع پر نوجوانوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ فیسٹیول وہاں دسمبر ۱۹۸۵ میں ہوا تھا۔ یہ ڈیڑھ سو سٹ آسٹریلیا کے مختلف حصوں سے آنے والے نوجوانوں کو دیا گیا ہے۔

۳۔ حیدرآباد میں ہر سال بڑے پیمانہ پر نمائش ہوتی ہے۔ موجودہ سال کی نمائش (جنوری ۱۹۸۶) میں اسلامی مرکز کی کتابوں کا اسٹال بھی رکھا گیا ہے۔ اس طرح کے مواقع سے دوسرے مقامات کے احباب کو بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔

۴۔ صدر اسلامی مرکز کی دو کتابیں اللہ اکبر (۲۸۸ صفحات) اور عظمتِ قرآن (۱۵۲ صفحات) چھپ کر آگئی ہیں۔ تذکیر القرآن کی کتابت کا کام جاری ہے۔ وہ خدا کے فضل سے ۲۵ ویں پارہ تک ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی اس کی دوسری جلد چھپ جائے گی۔ "الرسالہ کیسٹ" جلد اول اور کئی دوسری کتابیں زیر طبع ہیں۔

۵۔ ۲۶ نومبر ۱۹۸۵ کو علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کی طرف سے بڑے پیمانہ پر سیرت کا جلسہ ہوا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو خصوصی طور پر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس موقع پر علی گڑھ کا سفر کیا اور وہاں سیرت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس سلسلہ میں یونیورسٹی کی مختلف شخصیتوں سے ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

۶۔ "قرآن کا مطلوب انسان" نامی کتاب کا عربی ترجمہ ایک مصری عالم (دکتور سمیر عبدالحمید ابراہیم) نے کیا ہے اور وہ قاہرہ سے اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ اس کا عربی نام ہے ——— "الانسان القرآنی"۔

۷۔ دسمبر ۱۹۸۵ میں صدر اسلامی مرکز نے افریقہ کا سفر کیا۔ یہ سفر ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے تھا۔ اس سفر کی تفصیلی رپورٹ آئندہ انشاء اللہ الرسالہ میں سفرنامہ کے ذیل میں شائع کر دی جائے گی۔

۸۔ اسلامی مرکز کے سلسلے میں ہم کو روزانہ کی ڈاک سے جو خطوط موصول ہوتے ہیں ان میں سے چند بطور نمونہ یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔ ایک صاحب بمبئی سے اپنے خط (۸ نومبر ۱۹۸۵) میں لکھتے ہیں :

I was truely impressed with the monthly chronicle published by your organization, in fact, I am so disappointed for remaining ignorant about such a highly educating magazine, that I made up my mind to subscribe for it immediately. Moreover, a request is made to you to kindly enlighten me with some knowledge as to how this material is gathered. I am sure your organization is full of intellectuals which must be a very prestigious issue for you.

۹۔ ایک صاحب پورنیہ سے لکھتے ہیں :

"کئی مہینوں سے آپ کا الرسالہ پڑھ رہا ہوں۔ یہ ایک ایسا پرچہ ہے کہ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہر مہینہ کے رسالہ میں اکثر عنوان ایسے ہوتے ہیں کہ پڑھنے کے بعد آنکھ سے آنسو نکلنے لگتا ہے اور خوف خدا ایسا پیدا ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایگزامینشن ہال جیسا گارڈ ہماری حرکتوں کو دیکھ رہا ہے۔ بہر حال یہ ایک بہترین نسخہ ہمارے لیے ہے۔ اللہ آپ کو لمبی حیات دے تاکہ ہماری رہنمائی آپ ایسی کتابوں کے ذریعہ فرماتے رہیں۔ (۲۳ دسمبر ۱۹۸۵)

۱۰۔ ایک صاحب بنگلور سے لکھتے ہیں : میں کئی سال سے الرسالہ کا قاری ہوں۔ اس سے مجھے بہت فائدہ پہونچا۔ اس سے پہلے میں حق کی پکڈنڈی پر چل رہا تھا، اب میں حق کی شاہراہ پر چلتے ہوئے مومن کی کیفیت اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔ مولانا کا انداز بیان میرے

احساس میں ایسا اترتا ہے جیسے انھوں نے میرے دل کی باتوں ہی کی تصدیق کی ہے۔ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ مولانا صاحب سے مجھے بہت تقویت ملی ہے (۲۸ اکتوبر ۱۹۸۵)

۱۱۔ ایک نوجوان بنگلور سے اپنے خط میں لکھتے ہیں : الرسالہ کیسٹ "ایمان" موصول ہوا۔ تمام دوست و احباب کے ساتھ سنا تو ایسا محسوس ہوا کہ اب ہم اسلام میں صحیح طور پر داخل ہوئے ہیں اور اب ایمان لائے ہیں۔ بعض دوست و احباب کے تو آنسو نکل آئے۔ چوں کہ ابھی میں کم عمر صرف ۱۸ سال کا ہوں۔ جس کی وجہ سے بعض باتیں سمجھ میں نہ آسکیں۔ تو میں نے اپنے والد محترم سے ان باتوں کو سمجھا۔ جتنے بار بھی ہم تقریر سنیں گے تو بس یہی محسوس ہوتا ہے کہ اب ہمارا ایمان واقعی ایمان ہے (۱۵ دسمبر ۱۹۸۵)

۱۲۔ ایک صاحب جبل پور سے لکھتے ہیں : میں الرسالہ پچھلے چار سال سے برابر پڑھ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ دیگر چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی خرید لیا ہوں اور بہت شوق و ذوق سے اس کو پڑھتا ہوں الرسالہ مجھے ایسی عمر میں ہاتھ آیا جب میں اپنی زندگی کی شروعات کرنے جا رہا تھا۔ مجھے اسلامی لٹریچر میں اس سے معیاری اور کوئی رسالہ اب تک نظر نہ آیا۔ الرسالہ کے مختصر مضامین نے مجھے سوچ سمجھ عطا کی اور میری زندگی کو پوری طور پر تعمیری کاموں کے لیے بنا دیا۔ میں نے اپنے گھریلو مسائل حل کر لیے۔ کرایہ داروں کے مقدمات ختم کرنے میں مدد ملی۔ وغیرہ۔ غرض یہ کہ خط سے بیان نہیں کر سکتا کہ خدا نے مجھے کتنی نعمتوں سے نوازا۔ میرے خاندان میں میں سب سے چھوٹا ہوں لیکن خدا نے مجھے سب سے ہر معاملہ میں آگے رکھا ہے۔ خدا سے دعا ہے میری جلد ملاقات آپ سے ہو جائے اور میں تفصیل سے اپنی زندگی کے حالات بتاؤں۔ "الرسالہ ہر مرض کی دوا ہے" جس انداز میں جیسا چاہیں فائدہ اٹھا سکتے ہیں (۲۵ دسمبر ۱۹۸۵)

۱۳۔ امریکہ کی عالمی مذاہب کانفرنس (نومبر ۱۹۸۵) میں صدر اسلامی مرکز نے شرکت کی تھی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس کے ذریعہ سے عالمی سطح پر مختلف مذاہب کے ذمہ داروں سے ملاقاتیں ہوئیں اور روابط قائم ہوئے۔ اس سلسلہ میں واپسی کے بعد خطوط کا تبادلہ جاری ہے ایک خط جو مذکورہ عالمی کانفرنس میں شرکت کرنے والی غیر مسلم خاتون کی طرف سے صدر اسلامی مرکز کو موصول ہوا ہے اس کا عکس مقابل کے صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔

Dr. (Sayimatha) SIVA BRINDA DEVI
President, World Women Organisation

☎ .2342
Thilagavathiar Thiruvarul Adheenam
Machuvadi. PUDUKKOTTAI-622 001.
Tamil Nadu, South India.

26-11-1985

My most affectionate brother:

I consider it a matter of great good fortune that I had the rare opportunity of meeting you in USA during the conference of World's Religions and getting acquainted with you and with your culture.

I Pray to God to bless you and your country men with all prosperity, great achievement, satisfaction and peace.

You would not have forgotten me while receiving these my heart-felt greetings.

You will remember me as the Hindu Religious Head who recited the Rig Veda, lighted the candle, chanted the mantra for peace and offered prayers, representing Hinduism.

I Pray to God, with all the motherly tenderness I have, to make the world the abede of peace and bliss.

Yours Sincerely,

Dr.(Sayimatha) Siva Brinda Devi.

Maulana Wahiduddin Khan
C-29, Nizamuddin West
New Delhi - 110 013
INDIA

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

February 1986
Number 111

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

الرسالہ
کیسٹ

ماہانہ کیسٹ سیریز

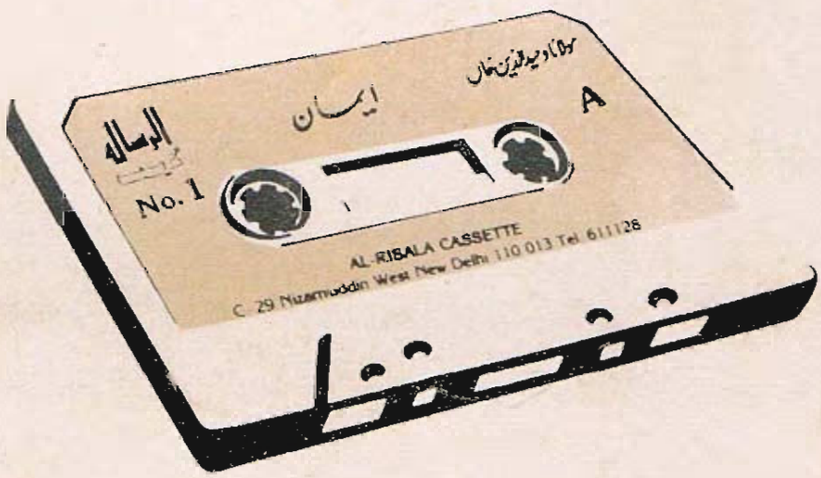

عصری اسلوب میں
اسلامی تعلیمات

مولانا وحید الدین خاں کی آواز میں

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ — ششماہی (۶ کیسٹ) ۱۴۰ روپیہ — سالانہ (۱۲ کیسٹ) ۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے ۵ ڈالر امریکی — ۲۵ ڈالر امریکی — ۵۰ ڈالر امریکی

مزید معلومات کے لیے لکھیں
الرسالہ کیسٹ
سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳
AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

Rs 3.00